Meyar
Monthly

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

[illegible] صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد ۵، شمارہ ۱ ماہنامہ جنوری ۱۹۵۵ء

معیار

مدیر

نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ جرائد کیلئے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نقشِ اوّل

سال نو کا پہلا شمارہ تین ماہ کے تعطل کے بعد پیش کیا جا رہا ہے جی نہیں چاہتا کہ اس تعطل کے اسباب پر روشنی ڈال کر مالی دشواریوں کا رونا رویا جائے۔ عام لوگوں کو اس سے کیا مطلب کہ ادبی رسالہ نکالنے میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں یہی بہت ہے کہ ان میں سے کوئی آٹھ آنے خرچ کر کے پڑھنے کی تکلیف گوارا کرلے۔ رہے وہ لوگ جنکو معیار سے خاص اور قریبی تعلق ہے تو ان پر سب حال عیاں ہے۔ ان سے کہا جائے تو آخر کیا کہا جائے۔ جو لوگ سب کچھ جانتے ہیں وہ عملی تعاون کرنا چاہیں تو انکے تعاون میں کونسی چیز مانع ہے۔ چار سال کی مدت میں اس سے پہلے بھی بہت سی پہاڑ جیسی مشکلات سے معیار کو دوچار ہونا پڑا۔ انکا ذکر صفحات میں شاید ہی کبھی آیا ہو۔ لیکن کبھی کبھی دوستوں کا تغافل حد سے بڑھ جاتا ہے تو مشکلات کا احساس دلا کر چونکانا ضروری ہے۔

تعطل کے یہ تین ماہ اسی قسم کے ہیں۔ ممکن ہے کہ انکی روداد آپ کو چونکا سکے۔ ان تین ماہ میں ہمیں کئی قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے اس تعطل پر دلی بے چینی محسوس کی اور آگے بڑھ کر مشکلات و موانع کو دور کرنے کیلئے عملاً امداد کی۔ کچھ لوگ وہ تھے جو بے چین تو ضرور ہوئے لیکن انکی بے چینی مزاج پرسی اور خالی خولی مشوروں تک رہی۔ اور چند لوگ ان دونوں قسم کے احباب سے بالکل مختلف بھی تھے۔ یہ لوگ قنوطیت پسند قسم کے تھے جو معیار کی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ عملی امداد کو تو دوسروں کیلئے چھوڑ چکے تھے اور اپنے لئے امید کی کرن دیکھ کر ہنس پڑنے اور مایوسی کی جھلک پر رو دینے کو کافی سمجھ رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے جب ایک بزرگ نے معیار کو بند کرنیکا مشورہ دیا تو مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک نئے نئے قائم شدہ پبلک ہائی اسکول پر جو اب ترقی کر چکا ہے، ایسی مشکلات آپڑیں کہ کچھ لوگوں کی طرف سے اسکے ٹوٹ جانے کی افواہیں پھیلائی جانے لگیں۔ اسوقت اسکے ایک پرجوش بانی نے جلسہ میں کہا تھا "جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسکول ٹوٹ جائے گا، میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ نوچ لوں۔"

برنارڈ شا نے کتنے رجائیت سے بھرپور لہجہ میں کہا ہے "واقعات و مصائب مجھ پر نہیں گزر رہے ہیں۔ بلکہ میں ہوں جو ان پر سے گزر رہا ہوں۔" اسوقت ہمیں اسی قسم کے لہجے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مشکلات کے ذکر سے دل شکستہ ہونے کے بجائے غفلت کے پردے چاک کر سکیں تو آیئے ہم آپکو معیار کا کچھ حال سنائیں۔

ستمبر ۸۵ء کا معیار شائع ہونے کے بعد اکتوبر کے شمارے کی کتابت تکمیل کو پہنچ گئی تھی مگر دیر سے۔ سوچا گیا کہ اکتوبر کا شمارہ روک لیا جائے۔ اور نومبر کا شمارہ نومبر کے ابتدائی تاریخوں میں روانہ کر دیا جائے۔ اسطرح اشاعت کی تاخیر کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ بات مناسب تھی۔ لیکن جب نومبر کے شمارے کی چھپائی کا مرحلہ آیا تو منتظمین کو اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ مجبوراً "ہنوز دلی دور است" کہہ کر کتابت شدہ کاپیاں دلی جانے سے روک دی گئیں۔ اب ہمارے سامنے روپیے کی فراہمی کا سوال آیا۔ اور ان سب دوستوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ جو اپنی ضروریات زندگی پر معیار اور اسکے مقاصد کو ترجیح دیکر چار سال سے برابر مالی مشکلات کے ہجوم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحلہ ہماری پچھلی تمام مشکلوں سے زیادہ سخت تھا۔ چار سال کے مسلسل مقابلے نے قوت برداشت کو تھکا سا دیا تھا۔ مگر دوسری طرف نظر جاتی تھی تو معیار کی افادیت اور اسکی بہتر رسالہ کی کوششیں سامنے آتی تھیں۔ جو لوگ قنوطی رجحان کے [illegible]

ان سے بھی جب کبھی پوچھا گیا کہ کیا معیار کی افادیت سے کسی کو اختلاف ہے تو یہ صرف مقامی احباب ہی نہیں بلکہ ملک گیر حلقہ تعا[illegible]
بارے میں دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ سب کو اسکی افادیت تسلیم تھی۔ بس اتنا تھا کہ کچھ لوگ مالی مشکلات کی طرف سے اپنے دلیر[illegible]
دسمبر ۵۳ء تک معیار کی مالی حالت کسی حد تک اطمینان بخش ہو گئی تھی۔ ایک ادبی رسالہ کی آمد اور اسکا خرچ حد
حالت اطمینان بخش کہی جا سکتی ہے۔ لیکن ۵۴ء میں دشوار ترین حالات پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں تنقید نمبر کی تیاری کو یہ
تیسے سرمایہ لگا کر نمبر تو نکال لیا گیا۔ لوگوں نے حقیقی میں آسمان کے قلابے بھی ملا دیئے لیکن اسے پھیلانے کی بم[illegible]
پیمانے پر نہ کی جا سکی کہ بجٹ کا توازن برقرار رہ [illegible] ۵۴ء کو چھوڑ کر پچھلا ایک جائزہ کو سامنے رکھنے کے بعد مستقبل سے ناامید ہونے کی
کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ رجائیت نے پکارا کہ اگر ہم کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مشکلات پر قابو نہ پا سکیں۔ اور اگلا سال ہمارے لئے
بہتری کا سال نہ ہو۔

ان حالات میں ہم نے پھر ایک حل سوچ نکالا اگر ایسا نہ ہوتا تو درحقیقت ہم اپنی ہمتوں کے امتحان میں ناکام ہو گئے ہوتے یہ کتنی بڑی
بدنصیبی ہوتی کہ ایک ایسے اہم فرض کے سلسلہ میں جیسے تعمیر تاریخ جیسی عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے ہم صرف اسلئے بھی چھوڑ دیتے
کہ اس کے لئے حالات سازگار نہیں تھے۔ افادیت کو تسلیم کرنے کے بعد مشکلات سے ڈرنا بڑی بزدلی کی بات ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ
اس کشمکش و پیچ سے بھی نکل آئے اور معیار کو بہر طور چلانے کا عزم کر لیا۔

بجٹ پیپر پر منتظمین قلم لے کر جھک گئے۔ اور مالی توازن کی پوری کوشش کی جانے لگی بالآخر ایک حل نکل آیا جو اخراجات اور آمد
کے لحاظ سے ناگزیر ضرورتوں کو پورا کر سکتا جو کچھ خسارہ تھا اسے معیار کی مستقل ماہانہ اعانت سے پورا کیا گیا چند مخلص ترین احباب کی توجہات سے
اعانتوں کی دشوار وادی بھی طے ہو گئی اور اب اگر ہمارے بجٹ کا کوئی پہلو توقع سے بہت زیادہ کمزور ثابت نہ ہوا تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید
ہے کہ آئندہ اشاعتیں پابندگی اور باقاعدگی کے ساتھ عمل میں آتی رہیں گی۔ بجٹ میں مستقل اعانت کے علاوہ دو چیزیں خاص طور سے آپکی توجہ کی مستحق
ہیں۔ ایک نئے خریداروں کا مسئلہ اور دوسرے نئی ایجنسیوں کا قیام۔ ظاہر ہے کہ دونوں چیزوں کی طرف جن احباب کی توجہ منعطف کرائی جا سکتی
ہے وہ وہی ہو سکتے ہیں جو عام لوگوں کی بہ نسبت معیار کی افادیت اور اسکے احوال واقعی کو کہیں زیادہ سمجھ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو لوگ اس
اس پوزیشن میں ہیں انھوں نے ابھی تک اپنے فرائض پر شاید اچھی طرح غور نہیں کیا ہے۔ لیکن اب غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت
حالات نے ہماری ذمہ داری بڑھا دی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ طبقہ جسکا میں ذکر کر رہا ہوں معیار کی جانب سے یکسر غافل نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایسے خطوط کی آمد کا ایک سلسلہ
جاری ہے جو مزاج پرسی اور پند و نصیحت سے پُر ہوتے ہیں۔ یہ چیز بری نہیں بشرطیکہ اسکے ساتھ عملی امداد بھی ہو۔ لیکن جو لوگ صرف مشورے
دے رہے ہیں اور استطاعت کے باوجود عملی امداد کو دوسروں کے لئے چھوڑ رہے ہیں ان سے شکایت ہو سکتی ہے۔ خالی مشورے تو وہ لوگ
بھی دے سکتے ہیں جو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن جو لوگ کچھ کام کر سکتے ہیں انھیں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ معیار کے لئے صرف ڈرامے
اور غزلیں لکھنا ہی کافی نہیں ہے اسکی بقا کا سامان کرنے کے لئے کچھ عملی جد و جہد بھی لازم ہے۔ اور اس جد و جہد کا ذمہ سب سے
اور فنکاروں کو لینا چاہیئے۔ یہ جد و جہد انکی تخلیقی کوششوں کے اثرات کو سماج کے رگ و پے میں ہی داخل نہیں کرے گی انکے اپنے دل میں
بھی توانائی اور حرارت پیدا کرے گی۔ وہ ادیب جو قلم کے ساتھ قدم سے بھی کام لے رہا ہے۔ سماج کے مزاج کو زیادہ کامیابی کے ساتھ
اور اسلامی ادب کو حقیقت میں ایسے ہی ادیب کی ضرورت ہے جو اسلامی ادب کی خدمت کیلئے قلمے اور سخنے ہی تیار نہ ہو بلکہ دامے، درمے اور قدمے
بھی اسکے تعاون پر کمربستہ و آمادۂ کار رہے۔

ماہنامہ معیار

م الدین رام نگری

روداد چمن

نہ کلیوں کے سینے میں جوشِ بہاراں، نہ پھولوں کے چہرے پہ کیفِ بہاراں
غم آگیں ہیں نرگس کی آنکھیں، ہیں سنبل کی زلفیں پریشاں پریشاں
گرجتے ہیں بادل، کڑکتی ہے بجلی، لپکتے ہیں کوندے، بھڑکتے ہیں شعلے
ہے سرو و صنوبر پہ سکتہ ساطاری، تحمل دیا سمن ہیں ہراساں ہراساں
گلستاں کے ماحول میں زندگی جس طرح پہلے خفتہ تھی خفتہ ہے اب بھی
نہ آموں کی ڈالوں پہ کوئل کی کوکو، نہ پھولوں کی شاخوں پہ بلبل غزلخواں
مناتے ہیں تقریبِ جشنِ بہاراں، مگر ہے فضائے چمن کا یہ عالم
کہ رنگِ بہاراں، نہ حسنِ بہاراں، نہ کیفِ بہاراں، نہ جوشِ بہاراں
یہ سُن سُن کے خوش ہو رہے تھے عنادل، کہ اب ختم ہونے کو ہے دورِ گلچیں
یہ کس کو خبر تھی کہ خود باغبانوں کے ہاتھوں سے تاراج ہوگا گلستاں
جسے سب سمجھتے ہیں پھولوں کا موسم، وہ دراصل پھولوں کا موسم نہیں ہے
بہارِ چمن سب سمجھتے ہیں جس کو حقیقت میں ہے وہ فریبِ بہاراں
ہمارے چمن کے مقدر میں پہلے نہ امن و سکوں تھا، نہ اب عافیت ہے
خزاں تو خزاں تھی بہاروں میں بھی ہے کبھی برق و باراں کبھی زورِ طوفاں
جو ہے بلبلوں کی نواؤں پہ بندش، تو روداد گلشن بیاں کیا نہ ہوگی
گذرتی ہے جو لالہ و گل پہ وہ ان کے پژمردہ چہروں سے خود ہے نمایاں
وہ بادل ہی برسا نہیں اس چمن پر جو گلشن کو دراصل گلشن بنا دے
چلی وہ ہوا ہی نہیں اس چمن میں جو خوشبو سے دشت و دمن کو بسا دے

کا شمارہ نومبر
کھر حلہ آیا تو
سامنے

(پروفیسر) ظفر احمد صدیقی

مذہب و ارتقا

اے قتیلِ مادیت اے شہیدِ ارتقا
چند تمثیلوں پہ ہے تیرے تخیل کی بنا

ہے نگاہوں میں تری مذہب بس اک ذہنی لباس
جو نہیں اب زندگی کے قامتِ موزوں پہ راس

گو یہ استدلال ہے چشمِ خرد میں ناصواب
خیر اس تمثیل کا دیتا ہوں تمثیل جواب

میں نے مانا جسم کی ہوتی ہے جب نشو و نما
تنگ ہو جاتی ہے اک دن اسے طفلی کی قبا

پیکرِ انساں مگر بڑھتا چلا جاتا ہے کیا
ارتقا کے زینہ پہ چڑھتا چلا جاتا ہے کیا

آخر اس نشو و نما کی کوئی حد ہے یا نہیں
ارتقائے جسم کی منزل بھی آتی ہے کہیں

جسم کا ہوتا ہے اس حد پہ پہنچ کر جو لباس
وہ بھی اگلے دور میں آتا نہیں کیا اس پہ راس

جس کو ایامِ جوانی میں کیا تھا زیبِ تن
تنگ ہو جاتا ہے پیری میں بھی کیا وہ پیرہن

یونہی کیا ممکن نہیں انسانیت کی ارتقا
ایک حدِ خاص پر آ کر بدل دے راستا

کارواں جیسے رواں ہو اک میانِ کوہسار
اک بلندی پر پہنچ کر ڈھال سے پھر ہو دوچار

یا اب اک ہموار میداں میں ہو داخل ناگہاں
آنکھ سے اوجھل ہوں پستی اور بلندی کے نشاں

ہے حقیقت بھی یہی شاہد ہے تاریخِ جہاں
راہِ طفلی میں تھا جب تک زندگی کا کارواں

ہر گھڑی تجدیدِ آئینِ کہن ہوتی رہی
حسبِ قامت اختراعِ پیرہن ہوتی رہی

لیکن آخر آ گیا اک حد پہ ہستی کا شباب
بن گیا اک غنچۂ نو کھل کے جاں پرور گلاب

پیکرِ ہستی کمالِ اوج اپنا پا گیا
عقل کی سرشاریوں کو یک بیک ہوش آ گیا

اب جوانی میں جو پایا زندگی نے پیرہن
غیر ممکن ہے کہ کم ہو حشر تک اس کی پھبن

پیرہن یہ صحتِ پیکر کا اب معیار ہے
ہو اگر ڈھیلا تو سمجھو جسم ہی بیمار ہے

ہے فریبِ ارتقا بد زیبِ پیکر کا حجاب
کیوں نہ کڑوی ہو شکر جب ہے مزہ منہ کا خراب

ارتقا ہے تیری نظروں میں عقد ٹوٹنے کا نام
نت نئی تبدیلیاں جن میں نہ ہو کوئی نظام

تو سمجھتا ہے اسی کو ارتقائے کائنات
ہو نہ دنیا میں کسی قانون و بندش کو ثبات

کل وہی ہو جائے جائز آجتک جو ہے حرام
زندگی رہ جائے یکسر بے اساس و بے نظام

مغربی سائنس کے اے پیروِ خیرہ نظر
غور کر اپنے ہی ان پیرونکے ارشادات پر

انکے نزدیک ایک عالم ہے اسیرِ ارتقا
ذرہ ذرہ ہے اسی قانون میں جکڑا ہوا

مانتے ہیں پھر بھی وہ قانونِ فطرت ہے اٹل
گردشِ شمس و قمر میں آ نہیں سکتا خلل

زہر میں تریاق کی تاثیر ہو سکتی نہیں
آگ اپنی تابشِ و حدت کو کھو سکتی نہیں

آم کا پھل نیم کی ڈالی میں آ سکتا نہیں
باہر اپنے دائرہ سے کوئی جا سکتا نہیں

بے نسیمِ صبح کے غنچے چٹک سکتے نہیں
جانور اپنی جبلت سے بھٹک سکتے نہیں

ارتقا کو جب نہیں ان ضابطوں سے کوئی کد
بندشوں پر فطرتِ انساں کی پھر کیوں ہے زد

ارتقا سے اصلِ انسانی بدل سکتی نہیں
اپنی حد سے آگے کوئی شے نکل سکتی نہیں

ہے وہی فطرت بھی اسکی اور انساں بھی وہی
رنج کے اسباب اور راحت کے ساماں بھی وہی

ہے وہی فرد و جماعت کی کشاکش کا رنگ
اب بھی خود غرضی میں اور ایثار میں باہم ہے جنگ

ہیں فریب اب بھی وہی تلبیس کی راہیں وہی
قہقہے ظالم کے اور مظلوم کی آہیں وہی

ارتقا سے آدمی بدلا نہیں زیرِ فلک
زر، زمیں اور زن کے جھگڑے بھی ہیں آجتک

اب بھی لیتا ہے انھیں آلات سے ابلیس کام
شعر و شاہد نغمہ و مطرب مے و مینا و جام

جسم میں اور روح میں اب بھی وہی ہیں رابطے
زندگی اور موت کے اب بھی وہی ہیں ضابطے

جانے پھر تیرا اٹل قانون سے مطلب ہے کیا
جسکا دشمن ہے تیرے نزدیک دینِ ارتقا

زندگی اپنا توازن آج کھو بیٹھی ہے پھر
امن اور آسودگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے پھر

نشہ میں ہو کیفیت جیسے کسی مجنون کی
اور بھی محتاج ہے آج اک اٹل قانون کی

زندگی ان ضابطوں سے جب چراتی ہے نظر
بند ہو جاتا ہے اس پر امن و آسائش کا در

ہوتی ہے جب بے نیاز اس سرمدی قانون سے
کھیلنے لگتی ہے ہولی آپ اپنے خون سے

کیا بتاؤں تجھ کو پائندہ ضوابط کا میں راز
تجھ کو اصل و فرع میں بھی تو نہیں ہے امتیاز

دین مجموعہ ہے دو اقسام کے قانون کا
اک وہ جن کی ہے بنیادی حقائق پہ بنا

جیسے بنیادی حقائق میں نہیں رد و بدل
یونہی یہ قانون بھی اپنی جگہ پر ہیں اٹل

دوسرے احکام جزوی یا فروعی مسئلے
ہے تعلق جن کا ہر لحظہ نئے حالات سے

ان اصولوں میں ہے لازم ہر گھڑی ترمیم بھی
روشنی [illegible] قوانین کی

ہے اصول اجتہاد اس امر کی روشن دلیل
ہر گھڑی ہوتی رہے تجدید ہستی کی سبیل

سچ تو یہ ہے ایک سطحی واقفیت کے سوا
ارتقا کے راز سے ہے تیرا دل ناآشنا

ارتقا دہرا عمل ہے وحدت و تفریق کا
یعنی طول و عرض میں ہو زیست کی نشو و نما

کونپلیں پھوٹیں نہالِ زندگی سے بیشمار
ربط باہم ہو مگر پہلے سے بڑھ کر استوار

شاخ اپنی حد میں چاہے جس قدر پھولے پھلے
اصل سے لیکن تعلق اور رشتہ بھی رہے

دین ہے وہ اصلِ تازہ جس سے شاخِ زندگی
دین سے ابزائے ہستی میں ہے ربطِ باہمی

شاخ کٹ کر اصل سے پھل پھول لا سکتی نہیں
اور کبھی نشو و نما کا اوج پا سکتی نہیں

ارتقا کی مختصر لفظوں میں یہ تفسیر ہے
یہ نہیں تو ارتقا اک خوابِ بے تعبیر ہے

اس حقیقت سے ابھی واقف نہیں تیری نظر
میں بتا دوں ارتقا کا کیا ہے مذہب پر اثر

پہلے نسل و رنگ کے زنداں میں انساں تھا اسیر
ارتقائے ذہن میں یہ دور بھی تھا ناگزیر

پہلے مصنوعی حدوں میں آدمی محصور تھا
سچ یہ ہے ناپختگی سے عقل کی مجبور تھا

تھا قبیلہ قوم یا اپنے وطن ہی پر فدا
تھی تگ و دو اسکی بس اس دائرہ ہی میں سدا

جسطرح محدود اور کم بیں تھی انساں کی نظر
تھے فرائض بھی اسی نسبت سے اسکے مختصر

بس کہ ہر عہد اور ہر ملت کی حالت تھی جدا
یوں ہی تھے ہر عہد ہر ملت کے رہبر بھی جدا

تھی طفولیت کی منزل میں ابھی تک زندگی
اپنے پاؤں چلنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی

ہر قدم پر غیر کی امداد پر تھا انحصار ۔۔۔ خام تھی فطرت ابھی اور عقل تھی ناپختہ کار
رفتہ رفتہ ذہن کی بستہ گرہ کھلنے لگی ۔۔۔ ہر حقیقت عقل کی میزان پر تلنے لگی
چشم انساں اب حجابوں سے گزرنے جانے لگی ۔۔۔ اب اشاروں اور کنایوں کو نظر پانے لگی
آگیا وہ دور جب عقل و خرد کی پختگی ۔۔۔ ہو سکے حامل خدا کے آخری پیغام کی
ماورائے رنگ و بو جب عقل انساں جا سکے ۔۔۔ رازِ عالمگیرِ اخوت کا سمجھ میں آسکے
معجزوں پر جب ہو دینی عقائد کا مدار ۔۔۔ دین کے پنہاں محاسن ہوں نظر پر آشکار
غیر کی مرضی سمجھ کر جنکو کرتے تھے قبول ۔۔۔ وہ نظر آنے لگیں اب اپنی فطرت کے اصول
آچکی تھی الغرض جو پختگی درکار تھی ۔۔۔ عقل اب اتمام نعمت کے لئے تیار تھی
ہوگیا اس نعمتِ حق کا غرض اتمام بھی ۔۔۔ آگیا انسانیت کو آخری پیغام بھی
عقل اب جتنا بھی راہِ ارتقا میں جائیگی ۔۔۔ دین اور فطرت میں ہم آہنگیاں ہی پائیگی
ہوگا اب انسانیت کا جسقدر بھی ارتقا ۔۔۔ اتنی ہی ہوگی حقیقت دین کی جلوہ نما

جائیگی اب بحر کی تہ میں جہانتک بھی نظر
پائیگی اتنے ہی نایاب و درخشندہ گہر

روشنی کا ایک بے حرکت ستوں ہے تجھکو دیں ۔۔۔ زندگی کی ریل کا جو ساتھ دے سکتا نہیں
دین تو انسانی فطرت کے اصولوں کا ہے نام ۔۔۔ بے زبان غیر سے اپنی ہی فطرت کا پیام
ہے وہ بجلی جس سے جل اٹھتا ہے اندر کا چراغ ۔۔۔ جگمگا اٹھتے ہیں پھر تابش سے اسکی باغ و راغ
یہ وہ سرمہ ہے جو دیتا ہے نگاہوں کو ضیا ۔۔۔ روشنی میں اسکی پھر ہوتی ہے ہر شے جلوہ زا
صورت خورشید عالمتاب اسکا نور ہے ۔۔۔ زیست کا ہر گوشہ اسکے نور سے معمور ہے
زندگی کا کارواں جس سمت بھی ہوگا مزن ۔۔۔ پائیگا اس نور کو ہر راہ میں پرتو فگن

لے بصر پھر کیوں گلہ سنج شب دیجور ہے
روشنی کس کام کی جب آنکھ ہی بے نور ہے

یقینِ محکم

توحید میکش

ابھی خامشی ہے جمود ہے، ابھی زندگی پہ زوال ہے
ابھی راستے بھی طویل ہیں، ابھی منزلوں کے نشاں نہیں
ابھی ظلمتیں ہی محیط ہیں، ابھی روشنی کا گماں نہیں
ابھی اضطراب ہے کرب ہے، ابھی حسرتیں ہیں ملال ہے

مگر آہنی مرا عزم ہے، مرا حوصلہ بھی جوان ہے
بڑی پختہ ہیں مری قوتیں، مجھے غم نہیں مجھے ڈر نہیں
مرے دل کے گوشوں میں ہمنشیں کوئی خوف کوئی خطر نہیں
مرے ولولوں میں ہے تازگی مری آرزوؤں میں جان ہے

میں اسیرِ دامِ ہوس نہیں، میں شکارِ حسن و ادا نہیں
میں فدائے جام و سبو نہیں میں نثارِ تابشِ زر نہیں
مجھے رفعتوں کی تلاش ہے، مجھے آپ اپنی خبر نہیں
نہیں خواہشوں کا غلام میں، مجھے فخر ہے میں گدا نہیں

مرا فکر میرا عمل ہی بس مرے ارتقاء کی کلید ہے
مرے ولولوں کی حیات بھی، مری کھیتیوں کا اناج بھی
مری سسکیوں کی دوا بھی ہے، مری ہچکیوں کا علاج بھی
نہیں سرنگوں مری ہمتیں، مری چوٹ گرچہ شدید ہے

مجھے ہے یقیں مری کاوشیں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی
مرے سامنے آپ ہی ایک دن مری منزلیں چلی آئیں گی
نہ فضائیں ہوں گی غم آشنا نہ فریب کھائے گی زندگی
نہ گریزاں ہوں گی مسرتیں نہ رہے گی ظلمت و خامشی

مطیع الرحمٰن صاحب اختر ایم۔ اے

سحر

ساتھیو! رات کی تاریک فضا لرزاں ہے

دامنِ نور پسارے چلی آتی ہے سحر

کیا اِسے روک سکے گی کسی منکر کی نظر

زرد پڑنے لگے آکاش پہ تاروں کے کنول

اب ڈھلکنے ہی کو ہے خوابِ گراں کا آنچل

جاگ اُٹھے گا ابھی دہر کا خوابیدہ شعور

سینۂ شب سے اُبلنے ہی کو ہے چشمۂ نور

سو چکے تم بھی بہت بسترِ راحت چھوڑو

اپنے خالق سے بغاوت کی یہ عادت چھوڑو

جاگ اُٹھو جذبۂ آگاہی و عرفاں لے کر

عزمِ نو۔ فکرِ جواں شوقِ فراواں لے کر

تم پہ مائل بہ کرم ہونے لگے ربِّ جمال

صبحِ پُرنور کا اِس طرح کرو استقبال

ساتھیو! رات کی تاریک فضا لرزاں ہے

(محترمہ) حور زبیری میرٹھی

راہِ نو

رنگ اور نور لئے صبح بہار آئے گی
وہ اُبھرتے ہوئے آثارِ تجلّی دیکھو

بزمِ غمناک اندھیروں کی اُجڑ جائے گی
کرمِ گرمیٔ رفتارِ تجلّی دیکھو

مُنہ چھپانے کو ہیں تاریک خزاں کے سائے
مُسکرائے گی تمنّا کی سکوں بیزِ بہار

جگمگائیں گے اُمیدوں کے ہزاروں سورج
اُفقِ قلب میں چمکے گی شعاعوں کی قطار

جب اندھیروں کے بھنور سے نکل آئیگی حیات
گیت گاتی ہوئی ہر سانس میں خوشیاں ہونگی

غم کی پرچھائیاں تھرّائیں گی لرزے گی جبل
کتنی نوخیز اُمیدیں سرِ داماں ہونگی

زندگی راہ بدل کر جو نکل آئے گی
ظلمتِ خواب کی تعبیر بدل جائے گی

یوسف شمیم (نیلور)

اقبالؒ

عالمِ خفتہ تری بانگِ درا سے جاگا
تیری ہی شعلہ دم آغوشِ نوا سے جاگا

روحِ تجدید و ترقی تری تحریر میں ہے
کلکِ تقدیر ترے حیطۂ تدبیر میں ہے

تجھ میں تھی برگِ گلِ تر کی نزاکت تحلیل
تیری آتش نفسی بن گئی گلزارِ خلیلؑ

اک نئے ڈھنگ سے تعلیم خودی دی تو نے
دل میں تنویر فشاں شمع یقیں کی تو نے

تو نے شاہیں کے ممولوں کو سکھائے انداز
دی انہیں جنسِ گرانِ پر و بالِ پرواز

تو نے لی یوں تو بہت سیرِ فضائے مغرب
تجھ کو کچھ بھی نہ پسند آئی ادائے مغرب

نورِ خاور سے ترا فکر منور ہی رہا
مشرقیت کے تقدّس کا ثناگر ہی رہا

کس کو پھر ہوگا تری دانش و حکمت میں کلام؟
تو نے عرفان کا دنیا کو بتایا ہے مقام

نجم الاسلام

حفیظ میرٹھی ——— ایک تعمیر پسند غزل گو

تقسیم ہند سے پہلے میرٹھ میں ایک ادبی انجمن دائرہ ادبیہ کے نام سے قائم تھی جو اب مرحوم ہو چکی ہے۔ اس انجمن نے اردو ادب کو کئی ابھرنے والے فنکار دیئے ہیں۔ انہی میں حفیظ صاحب بھی آتے ہیں۔

اس وقت حفیظ صاحب غزل میں تعمیر پسند رجحانات پیش کر رہے ہیں اور تعمیر پسند ادبی تحریک کے شاعروں میں بحیثیت غزل گو سر فہرست ہیں۔ شروع میں جب تعمیر پسند تحریک وجود میں نہیں آئی تھی حفیظ صاحب کے خیالات اور انکے طریقِ اظہار میں قدیم و جدید رنگوں کا امتزاج تھا۔ مگر تعمیر پسند نظریہ کو اپنانے کے بعد انھوں نے اپنی غزلوں میں چند ایسی حقیقتوں کو پیش کیا ہے جنکی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ان کا شعور واضح اور روشن ہے۔ اور اسکی مناسبت سے لہجہ میں بھی تبدیلی ملتی ہے۔ یہ تبدیلی آج کے دور میں اجنبیت آمیز نہیں رہی ہے اس لئے مجھے اُمید ہے کہ حفیظ صاحب کی غزلیں اور انکے خیالات و افکار صحیح اسپرٹ میں اپنے مخاطبوں تک پہنچیں گے۔ اور صحیح اسپرٹ میں ہم ان پر اچھائی برائی کا حکم لگا سکیں گے۔

حفیظ صاحب اپنے مخلص احباب کے حلقے میں صرف "حفیظ صاحب" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں یہ "صاحب" نام ہی نہیں کبھی کبھی تخلص کا جزو بنجاتا ہے اسوقت مقطع اپنے فنکار کی شخصیت کو زیادہ جامعیت سے پیش کرنے لگتا ہے۔ بہرکیف حفیظ صاحب کا نام انکے دوستوں کے لئے اب کوئی ابہام نہیں رکھتا۔ جب ہم یہ نام سنتے ہیں تو ذہن حفیظ جالندھری یا حفیظ ہوشیارپوری کی طرف نہیں جاتا، حفیظ میرٹھی کی طرف جاتا ہے

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اگرچہ ابھی میدانِ سخن میں نووارد ہوتا ہے مگر سننے والوں کے دل کو اسکا کوئی شعر ایسا بھا جاتا ہے کہ مدتوں یاد رہتا ہے۔ اسکی یاد شاعر کی یاد دلاتی رہتی ہے یہیں سے اسکی شاعری توجہ طلب بنتی ہے ایسے شعر اپنے مضامین کے اعتبار سے کچھ زیادہ انوکھے نرالے نہیں ہوتے مگر طرزِ ادا میں ایسی دلکشی ہوتی ہے کہ سننے والا توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سننے پر مجبور ہوجاتا ہے اور اسکی یہ توجہ دیر تک قائم رہتی ہے۔

حفیظ صاحب کے جس شعر نے لوگوں کی توجہ پہلے پہل اپنی طرف کھینچی وہ اب بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ یہ شعر کسی طرحی مشاعرہ میں پڑھا گیا تھا ؎

کرم تیرا کہ ان آنکھوں کو تو نے ندیاں بخشیں
الٰہی ایک آنسو حُسن کے دامن کے قابل بھی

بقول محمد حسن عسکری شاعر کو عشق کی اُلجھنوں کے علاوہ کچھ ایسے تجربے کرنے ضروری ہیں جو اسکے فن کو "علاج الغربا" کی صف سے اونچا کرتے ہیں اور ایک عظیم تر تخلیقی عمل میں معاون بنتے ہیں چنانچہ انھوں نے میرؔ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے جس نے صرف ایک عشق کا غم ہی اپنے شعروں میں جمع نہیں کیا تھا بلکہ معلوم نہیں ایسے کتنے اور درد و غم بھی تھے خالص عشق کے تجربات و عمل کا میدان محدود ہے اور یہاں متعین قسم کے تجربوں کے سوا کچھ نہیں۔ مجھ اور حسرت میں فرق جو کچھ ہے وہ سوسائٹی اور اپنے اپنے طریقِ اظہار کا ہے۔ تجربہ مختلف نہیں۔ طریقِ اظہار کے اس فرق کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا مگر وہ مناسبت بھی تنقیدی نظر کی کچھ کم محتاج نہیں جو ہمیں تجربہ کی یکسانی میں ملتی ہے

حفیظ صاحب نے زندگی کی اس تیز رفتاری کو سمجھنے کی کوشش کی چنانچہ اب ہمیں انکے کلام میں بدلتے ہوئے حالات کے اثرات نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے جھلکتے نظر آتے ہیں۔ حفیظ صاحب ہی کا ایک شعر ہے ؎

اک انداز رہ رہ ہے قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

شاعر کو تنگیٔ داماں کا شکوہ ہوتا ہے تو اسی نکتہ کو نظر انداز کر دینے سے ہوتا ہے کبھی کبھی وہ چند کلیوں پر قانع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قدرت کی نیرنگیاں چمن کے دامن کو کتنی رنگا رنگ کلیوں کتنے طرح طرح کے پھولوں سے بھر دیتی ہیں۔ ملانہ وضعداری کو ایک حد تک نبھانا برا نہیں مگر اس پر نئے تقاضوں اور نئی ذمہ داریوں کو قربان کر دینا غلط ہے۔ جو لوگ شعر کی تجارت کرتے ہیں ان سے تو خیر کوئی بحث نہیں مگر جنھوں نے ادب اور شعر کے بلند مقاصد یعنی علم و فن کی چند مخصوص روایات کو مقدم رکھا ہے ان سے ظرف اور

نطق کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا جا سکتا ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ حفیظ صاحب کی پچھلی شاعری کیسی تھی اور اب انھوں نے غزل میں تعمیری رجحانات کو داخل کرنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سے پہلے کہ جدید کلام پر کچھ کہا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے ابتدائی دور کے کلام کا انتخاب کسی قدر تفصیل سے پیش کر دیا جائے۔ اس سے دو باتیں واضح ہو جائیں گی۔ ایک تو حفیظ صاحب کی ذہنی تعمیر اور انکے نفسی ارتقاء پر روشنی پڑے گی اور دوسرے بعض لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ غزل میں اجتماعی رجحان کو بگڑے ہوئے یا ناکام شاعروں نے اپنایا ہے اسکی تردید بھی ہو جائے گی۔ حفیظ صاحب پہلے بھی ناکام نہیں تھے اور اب بھی نہیں ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:۔

وہ بھی آزردہ نہ ہوں دل کی خلش بھی کم کریں
یعنی شکوہ تو کریں اُن سے مگر مبہم کریں
پھر کریں تعریف اُن کے مُنہ پر اُنکے حُسن کی
بے وفا کہہ کر یکایک پھر انھیں برہم کریں
چاندنی کے ساتھ ہی تارے بھی رخصت ہو چلے
اس مناسب وقت پیمانِ وفا محکم کریں

دب جائے گی یہ کشتی گر اسے ساحل ملا
زندگی کو ہر قدم پر ایک طوفاں چاہیئے
یہ فریب آب و گل ہے اس پہ کیا اُٹھے گی آنکھ
روح گلشن چاہیئے، جانِ گلستاں چاہیئے

کیا جانیے دل کو توبہ کی یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی
اُسکے بھی کرم پر حرف آیا اپنی بھی خطا بدنام ہوئی
بھڑکی ہوئی آگ دبائی بھی تو اُٹھنا دھواں کب رُک پایا
ہم ضبطِ فغاں کرتے ہی رہے اور دل کی حکایت عام ہوئی

کہاں وہ بزم ازل کے جلوے کہاں یہ دیر و حرم کے پردے
جمالِ رُخ پر مچلنے والے نقاب رخ سے بہل رہے ہیں
زہے گداز غم محبت خوشا یہ آداب سوز الفت
نہ کچھ دھواں ہے نہ کوئی شعلہ بڑے سلیقے سے جل رہے ہیں۔

کیا جانے کیا سبب ہو کہ جی چاہتا ہے آج
رو ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم
اب انتہائے ضبط نے دل میں لگائی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم
کیسا خیال کس کی محبت، کہاں کا عشق
یونہی جھجک گئے تھے ترے پاس آ کے ہم

ہائے وہ سادگی رنگا رنگ
ایک عالم میں سینکڑوں عالم
اُن کی دزدیدہ پڑ رہی ہے نظر
اپنے لغزیدہ اُٹھ رہے ہیں قدم

بے تابیاں ہیں اور نہ غم انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے
کیا عہد تھا کہ آپکی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپکی اُلفت بھی بار ہے
سچ جان میں نے تیری تمنا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا تجھے اختیار ہے

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا اشارہ کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا
میں تو اس درد کے انجام سے تھراتا ہوں
جس کے آغاز نے تم کو مرا غم خوار کیا
رکھ لیا ہاتھ مرا اپنے دھڑکتے دل پر
میں نے جب عہد وفا کے لئے اصرار کیا
ہائے مجبوریٔ الفت کی یہ باتیں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

شروع عشق کی ناکامیاں ارے توبہ
خود اپنے دل سے مجھے مدتوں حجاب رہا
دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے۔
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

انھیں بھلا کے تو کچھ اور ہو گئے برباد
ہوا سکوں ہی میسر نہ اضطراب رہا
زباں تو پھر بھی زباں ہے نگاہ تک نہ اٹھی
مگر وہ شکوہ کہ اس پہ بھی کامیاب رہا

نہ شوخیوں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ لذتیں جو تری برہمی سے ملتی ہیں
جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں
نہیں ضرور کہ قربت ہو وصل کا حاصل
کہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں
اگرچہ ترکِ تعلق کو ایک عمر ہوئی
وہ نظریں اب بھی اسی دلکشی سے ملتی ہیں
دلِ تباہ مری بات کا خیال نہ کر
ملامتیں بھی تو ہمدردی سے ملتی ہیں

اُف رے شکایتِ جفا واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں روئے دور جا کے ہم
ہائے یہ کیا مقام ہے ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم حسن کی آستیں بھی نم
شاید اسی طرف سے کچھ سلطنت میں ہو گئی کمی
جانبِ کوئے دوست جو آج نہ اٹھ سکے قدم

اس میں شک نہیں کہ یہ اشعار فنی دلکشی کے لحاظ سے اچھے سے اچھے ملک کے لئے سرمایۂ افتخار کہے جا سکتے ہیں. ان کو پڑھنے سے وجدان شعری نئی تحریک بھی پاتا ہے لیکن یہ تحریک اُسے کسی بہتر راہ کی طرف نہیں لے جاتی پہلی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع میں حفیظ صاحب کی تخلیقی کوششوں کا پوری طرح سوچا سمجھا مقصد نہیں تھا. پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جو حفیظ صاحب کے اس پچھلے کلام کے رنگ کو مذاقِ عام کی سطح سے اونچا کرتی ہیں. انکی لغزشوں میں بے راہ روی نہیں ہے وہ عشق کی روایات کو پیش کرتے ہیں مگر انکا ایک خاص اصول بھی ہے جو انھیں ایک حدِ خاص سے آگے نہیں بڑھنے دیتا نہ وہ گنہگار بننے پاتے ہیں نہ اپنی معصومیت جتاتے ہیں. جدید نفسیات اس سلسلے میں کیا کہتی ہے یہ ذرا جداگانہ بحث ہے. شاید اُسے جھجک سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر اس پر بھی غور کر لیا ہوگا کہ "پیش دستی" میں نفسیاتی و ذہنی الجھنیں جھجک سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں. یہ کچھ کم نہیں کہ حفیظ کا سوز و گداز مجبوریوں کے سانچے میں ڈھل کر تبسم آمیز نکھار تو بنجاتا ہے. مگر وہ "نالہ و فغاں" یا بصورتِ دیگر "طاقتِ نالہ اور یارائے فغاں" کے گلے شکوے نہیں کرتے. اپنے آپکو اتنا سنبھالے رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں. کہیں کہیں اس ابتدائی دور کے کلام میں حفیظ صاحب نے نفسیاتِ انسانی کو ایسے زاویہ سے بھی دیکھا ہے جو انکے رجحاناتِ ذہنی کی صحت مندی پر دلالت کرتا ہے. ایسے اشعار یقیناً "تعمیری" کہے جا سکتے ہیں یوں تو ہر شاعر کے کلام میں ایسے اشعار ڈھونڈیے تو دو چار مل ہی جائینگے. استاد طالب علم سے کوئی مشکل سوال کرتا ہے. طالب علم کبھی گھبرا کر "ہاں" میں جواب دیتا ہے کبھی "نہیں" کہہ دیتا ہے. دونوں میں سے کوئی نہ کوئی جواب صحیح نکل ہی آتا ہے. مگر اسے تک بندی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی. اس سے کلام کی عظمت گھٹتی ہے. کلام کی عظمت ہمیشہ مربوط سوچ بچار، فکر انگیزی اور صحت مند قسم کے نفسی ارتقا سے بڑھتی ہے. اس نظر سے جب کبھی میں نے حفیظ صاحب کے کلام کا جائزہ لیا مجھے انکی شاعری میں کامیابی کے بہت سے عناصر نظر آئے

فانی کے مقطعے عموماً بڑے زوردار ہوتے ہیں. فانی کے بہترین اشعار زیادہ تر انکے مقطعے ہیں جن میں انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت سے غمِ ہستی کے اسرارِ فنا و بقا پر قابلِ قدر نکتے پیش کئے ہیں حفیظ صاحب نے اپنے تخلص سے تو فائدہ نہیں اٹھایا مگر انکی غزلوں کے مقطعوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنے کے بعد یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شعر کافی سوچ کر کہا ہے اور کافی سنبھل کر ادا کیا ہے جس سے نہ علم کا وقار گھٹنے پاتا ہے نہ جذبہ میں تصنع پیدا ہوتا ہے انکے یہاں نہ علم کی خشونت ہے نہ فن کی پیترہ بازی جو آرٹ کو بقولِ آل احمد سرور "Miniature Painting" کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی. انکے مقطعوں میں ذہنی ارتقا کی جھلک نظر آتی ہے اور سوچ بچار کے بہت سے گوشے ترتیب کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اسی بنا پر میں نے اوپر انکی شاعری میں کامیابی کے عناصر کی نشاندہی کی ہے. شروع شروع میں جب زندگی غیر مقصدی اور غیر ذمہ داری کے عہد سے دو چار تھی تو اشعار میں اسی قسم کا رنگ ملتا ہے. اگرچہ اس طرزِ زندگی کی محدودیت کو انھوں نے کبھی دل سے نہیں جھٹلایا. انھیں اس بات کا

خیال ہمیشہ رہا کہ دُنیائے جدوجہد سے کنارہ کشی نے انکی زندگی کو محدود کر رکھا ہے۔

دُنیائے جدوجہد کہاں ہیں کہاں حفیظ
اپنی تو کائنات بس اشعار ہی رہے

پھر جب حالات کے زیر اثر اور ارتقائے فکری کے تحت مسائل زندگی پر گرفت بڑھتی گئی تو انھوں نے ایک نئے طرز زندگی کی طرف اثباتی طور سے پیشقدمی شروع کر دی اور زندگی کو اتنا بدل ڈالا کہ "تخلیق شعر رنگیں" اور "بادہ خواری" کے اس مقوئ شباب عمل سے جب دوزخ نگلے جاتے ہیں اور جنتیں اُگلی جاتی ہیں (چاہے وہ روایتی ہی کیوں نہ ہو) ———
نئے دور کے تقاضوں کو ودد کا تعلق بھی نہ رہا اور وہی حفیظ صاحب جو کبھی "فخر میکدہ" تھے سر بزم "درس پاکبازی" دیتے نظر آنے لگے۔ اب وہ زندگی کو موت سے ٹکرا کر عشق و مستی کے چند عظیم اور انوکھے تجربوں کو اپنے اشعار کی زینت بنا رہے ہیں ؎

حُسن جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آ کے موت سے ٹکرا گئی حیات

بہر کیف اب کچھ مقطعے ملاحظہ فرمایئے جنھیں ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ایسا بھی کیا حفیظ طبیعت کا انقلاب
اس بے وفا کے غم سے مسرت ہوئی مجھے

اس غم میں حفیظ آخر کب تک چپ چپ سے کھوئے کھوئے سے
سودائے محبت چھوڑ دو بھی، اب اٹھو دیکھو ! شام ہوئی

حفیظ اپنی یہ بادہ خواری اور اس پہ تخلیق شعر رنگیں
ہزار دوزخ نگل رہے ہیں ہزار جنت اُگل رہے ہیں

فریب دیر و حرم ہی نہ کھا سکوں گا حفیظ
بہت قریب سے دیکھے ہیں گمرہی میں نے

چل دیا جائے کہ صراحی کی سرحد سے حفیظ
ایسے آوارہ کا ناحق آپ اتنا غم کریں

وہی دیوانہ سا، بربادسا، شاعر سا حفیظ
تم نے بھی کس کے لئے دل کو گنہگار کیا

جو اٹھ گئیں وہ نگاہیں تو کیا کرو گے حفیظ
پناہ زہد میں اب تک تو یہ شباب رہا

کافر سرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظ
اُس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

ان اشعار کا حفیظ وہ حفیظ نہیں جو آج غزل میں تعمیری رجحانات کا تجربہ کر رہا ہے۔ ان میں ایک ایسا کردار ملتا ہے جو بے نیاز و بے پروا اور سرورِ عشق کا شیدا ہے مگر یہاں بھی حفیظ صاحب نے روایت کی اندھا دھند پیروی نہیں کی ہے۔ جسکے ثبوت میں اوپر کے کئی اشعار کی طرف نشان دہی کی جا سکتی ہے
اسکے بعد ایسے مقطعے بھی ملاحظہ کیجئے جن میں عشق کی محدود دُنیا سے نکلنے کا احساس پایا جاتا ہے یہی احساس ہے جو آگے چل کر ایک عظیم مقصد زندگی کے عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور درحقیقت اُسی وقت سے تعمیری رجحانات کی ابتدا ہوتی ہے۔

دُنیائے جد و جہد کہاں ہیں کہاں حفیظ
اپنی تو کائنات بس اشعار ہی رہے

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

اسی لئے تو یہ مضراب و مار روئے ہیں
حفیظ تارک چنگ و رباب ہو بھی چکا

اور اب یہ رنگ کلام دیکھئے۔

حفیظ اپنی زباں نو وقف اظہار حقیقت ہے
برائے غیر سی مجھ سے غزل خوانی نہیں ہوتی

حفیظ اس میں شامل خلوص عمل ہے
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو وہی حفیظ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی

بہ وقتِ عمل اور یہ حفیظ آپ کی مستی
اچھی نہیں، وہ نیند جو ہنگامِ سحر آئے

حفیظ ہم تو روانہ ہوئے خدا حافظ
قدم اُٹھائے گا کب کارواں نہیں معلوم

طے کیجئے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظ
اک بزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات

اُس دور کے کلام میں جب کہ وہ ایک بہتر طرزِ فکر کی جستجو کر رہے تھے ابھی اُس تک پہنچے نہیں تھے کئی باتیں بیک نظر سامنے آتی ہیں ایک کا تذکرہ تو میں ضمناً پہلے ہی کر چکا ہوں یعنی غیر محتاط سپردگی کے بجائے ان کے یہاں احتیاط اور اصول پسندی ملتی ہے۔ اب اسے چاہے اصول پسندی کا اثر کہہ لیجئے یا حفیظ صاحب کی افتادِ طبع کی صلاحیت کہ ہمیں اس کلام میں عشق کا جو تصور ملتا ہے اور عشقیہ شاعری کے جو عناصر جستہ جستہ نظر آتے ہیں وہ اپنے فنکار کو ایک جُدا رنگ میں پیش کرتے ہیں جسے انہوں نے جدید کلام میں ایک بلند تر اخلاقی مقصد کی جِلا دیکر نکھارا ہے "فرار" میں حفیظ صاحب نے کہا تھا:۔

ہوا ادھر ہوس کے مارے ہمیں نہ دیکھ سکیں — حریمِ غم کے مناروں سے ہمیں نہ دیکھ سکیں
جہاں زمیں کے کنارے ہمیں نہ دیکھ سکیں — جہاں فلک کے ستارے ہمیں نہ دیکھ سکیں

مرے حبیب خطِ کہکشاں سے دور کہیں

ہمارے عہدِ وفا پر کلی بھی منہ نہ چڑائے — گلاب شوخ اشارے نہ سمجھ کے نہ بلائے
قدم سنبھل کے اُٹھاؤ نسیم جاگ نہ جائے — سرکو سے نہ گل بھی کہیں ہنسی سے اُڑائے

سکوتِ شب میں ہر اک رہرواں سے دور کہیں

اسی دور کی ایک دوسری نظم "وعدہ" کا موضوع بھی عشقیہ ہے۔

اب نہ دیکھو گی مجھے صحنِ زنگیں کے قریب — اب نہ پاؤ گی مجھے پردۂ زریں کے قریب
اپنے گلزار کے ان سنبل و نسریں کے قریب — زلفِ مشکیں کے قریب عارضِ سیمیں کے قریب

اب نہیں آؤں گا اے جان نہیں آؤں گا
حرمِ حسن کے قربان نہیں آؤں گا۔

مگر تعمیری ادب کی تحریک اس طرزِ فکر کی اصلاح کر چکی ہے اب بھی وہ دل کی دھڑکنیں سن رہے ہیں مگر ایک بلند اور وسیع تر نصب العین نے زندگی کے دوسرے مقاصد کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے

میں سُن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

دیکھئے حفیظ صاحب نے یہ نہیں کہا کہ پہلے ذرا غمِ جہاں سے نپٹ لیں پھر حیات کا ماحول خوشگوار ہونے پر عیش ہی عیش منائیں گے۔ نہیں! وہ اس ہیجان انگیز اور جذباتی استدلال کے بجائے محبت کا ایک مستقل نظریہ پیش کر رہے ہیں یہ نظریہ انھوں نے اسلام کے ہمہ گیر تصور سے اخذ کیا ہے۔ اس میں تعمیری عناصر کی فراوانی اور توافق کارفرما ہے۔

شعر و شاعری کے سلسلے میں داخلیت اور خارجیت کی بحثیں عموماً فنکار اور نقاد کے لئے وبال بن جاتی ہیں کبھی کبھی اصل معنی تک ان بحثوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ داخلیت کو نظر انداز کیجئے تو تخلیقات "لفظ بے معنی" ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خارجی آب و رنگ سے آنکھیں پھیر لیجئے تو انکی حیثیت "معنی بے لفظ" کی سی ہو جاتی ہے۔ اچھی شاعری وہی ہے جو "لفظ با معنی" کی تعریف میں آ سکے اور اسکے لئے فن اور فکر کا جمالیاتی اور اخلاقی معیار پر پورا اُترنا ضروری ہے سادہ سی بات ہے جیسے خیالِ حسن اور حسنِ عمل کی گورکھ دھندے والی بحث کے بغیر بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ خارجی آب و رنگ بھی ایک چیز ہے مگر حسنِ داخلی کے بغیر تو ادب اور شعر میں جان اور توانائی ہی نہیں آتی۔ اور داخلی حسن کے لئے چاہئے ایک صحت مند قسم کا طرزِ فکر اور توانائی سے بھرپور شعور۔ اقبال کی اصل وہی ہے جسے اقبال نے نغمۂ نے کی روح کہا ہے

آتا ہے ان سے نغمۂ نے میں سرود ہے
اصل اسکی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

اور نے نواز کا دل حقیقت میں دل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ دلِ آگاہ ہو جاتا ہے، حفیظ صاحب نے اسکو زندگی کا جزوِ لازم کہا ہے

اے دلِ آگاہ غم کیسا خوشی ہوتی ہے کب
زندگی ہوتی ہے لیکن زندگی ہوتی ہے کب

حفیظ صاحب نے شعور و آگہی کے اس رمز کو اپنے لئے صحیح راہ بنایا ہے وہ تخلیقی عمل کے لئے اس شعور کو ضروری سمجھتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کو زندگی آموز بنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سپردگی پر فکر غالب ہے مگر جب وہ فلسفہ کی باتیں کرتے ہیں تو اسمیں فلسفہ بے کیف نہیں ہوتی اسمیں سوز ہوتا ہے جو خونِ جگر سے آتا ہے

یہ تو رہا داخلی پہلو۔ فن اور خارجی پہلو کے بارے میں حفیظ صاحب کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے لئے میں حفیظ ہی کا اک شعر پیش کرتا ہوں

جو ہر فن بھی نمائش کی کوئی شے تھی حفیظ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہو جاتا

تقسیم سے پہلے انکے یہاں اجتماعی رجحانات کا اظہار نہیں ملتا مگر اسکے بعد انھوں نے مطالعہ سے اپنے اجتماعی شعور کو بہت نکھارا ہے۔ انھوں نے اسلام کے نظام اجتماعی کو بڑی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ غزل میں ان رجحانات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے غواصی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہاں رموز و علائم کے ذریعہ تفصیل کو اجمال کا جامہ پہنانا پڑتا ہے۔ زندگی کے وسیع و عظیم اور بحر ذخار کی سی پہنائیاں رکھنے والے تجربوں کو الفاظ کے کوزوں میں بند کرنا ہوتا ہے۔ زندگی اور اسکے تجربوں کا گہرا شعور رکھے بغیر یہاں کوئی تخلیقی قسم کا کام کرنا مشکل ہے۔ ویسے روایتی شاعری تو سبھی کر لیتے ہیں مگر سب کو صحیح معنوں میں اسکا کریڈٹ نہیں ملتا۔ کریڈٹ اسی کو ملتا ہے جسکے یہاں کچھ مستقل نئے اضافے بھی ہوتے ہیں

حفیظ صاحب نے غزل میں تعمیری رجحانات کو پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اُسے اسی نظر سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی پہلی باضابطہ کوشش انھوں نے ایک طرحی مشاعرے میں کی تھی۔ باضابطہ میں نے اسلئے کہا کہ اس سے پہلے بھی اگرچہ انکی غزلوں میں جستہ جستہ تعمیری قسم کے اشعار ملنے لگے تھے مثلاً

انسان کو بزم ہستی میں اعداد کا پیکر پایا ہے
گر تخت پہ ٹھوکر دیکھی ہے چوکھٹ پہ کبھی سر پایا ہے
تہذیب نو سے رشک جناں بن گئی زمیں
یہ اور بات ہے یہاں انساں نہیں رہا

مگر ابتک کوئی غزل پوری کی پوری اسی رنگ میں نہیں کہی تھی۔ یہ بات عجیب تھی کہ باوجود اسکے مشاعروں کی فضا سے یہ رنگ بالکل مختلف تھا۔ مشاعروں میں بہت سراہا گیا۔ یہ میں ۱۹۴۷ء کی بات کہہ رہا ہوں جب غزل کہنا سننا اور مشاعرے کرنا بڑی جی داری کا کام تھا۔ حفیظ صاحب نے اپنی غزل کو یکسر بدل ڈالا۔ غزلیں تغزل کے بجائے اب اجتماعی شعور کی آئینہ داری کر رہی تھیں۔ انکی یہ پہلی تعمیر پسند غزل جسے، ویسے میں نے باضابطہ کوشش کہا ہے، انکے اس ذہنی انقلاب کی مظہر ہے

ہر سکوں کی تہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستاران نغمہ! چھوڑ کر تار رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں
بانئے رسم نیرنگیاں ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں
ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں عزم تعمیر جہاں رکھتا ہوں میں
آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

یہاں سے حفیظ صاحب کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے ہم تعمیری دور کہہ سکتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکے اس دور کے چمنستان غزل سے مفصل خوشہ چینی کی جائے تاکہ قارئین کلام کے بارے میں پوری طرح رائے قائم کر سکیں۔

رہ عشق کے تقاضے کسے جائیے تلانے — کہیں جستجو کے حیلے کہیں ہوش کے بہانے
بھلی مہربانیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں — وہی رخ قرار پایا جو ہوا نے
اٹھیں بہت جہاں میں کوئی کیوں تمہارے — [illegible] کبھی خیال نہ تجھے جا شانے

کئی منزلیں تراشیں کئی کارواں بنائے
جو سفر کا نام آیا مرے پاؤں لڑکھڑائے
وہ طلب بھی کیا طلب تھی وہ کشش بھی کیا کشش تھی
مری سمت یوں بڑھے ہم نہ خود اپنے ہاتھ آئے
کہیں کلفتوں کا رونا کہیں غفلتوں کا رونا
کسی زندگی ہیں کانٹے کسی راستے ہیں سائے
وہی میری بیکسی پر لگے ہنسنے دور ہٹ کر
جو وفا کا عہد کرتے مرے ساتھ ساتھ آئے

کسی حسین تر تسکین نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بخود مرا پیام شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے
ہر ایک میکش کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہِ ساقی
کسی کو ہے حکم جاں نثاری کسی کو اذنِ وفا نہیں ہے

ہوا قدرداں اس قدر تو زمانہ — کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ
مجھے دوستی کی قسم دینے والے — مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ
نہ ٹپکا ماضی و حال کی الجھنوں میں — صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

اک عشق سبک سر ہی سردار ہے تنہا — ارباب خرد آئے نہ اصحاب نظر آئے
ہنستی ہی نہیں اب ترے جلووں سے نگاہیں — آنکھوں کو بڑی دیر میں آداب نظر آئے
خاکے بھی نہ بن پائے ابھی اہل گماں سے — کچھ اہل یقیں خون سے ادھر رنگ بھی بھر آئے

اتنا ہی جانئے اس دور میں مفہوم سکوں — جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا
یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں — ہائے کیا ہوگا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا
جگمگانے لگے ذرے تو ستارے نہ رہے — ترا اندھیرا بھی اے نور سحر دیکھ لیا

خرد کی بات یہ ہے کہ گذر بھی جائے دل — خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم
خلوصِ عشق ذرا تو بھی دیکھنا بڑھ کر — حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم

کھلیں کہ بند رہیں راستے نکے دیوانے — حریم صبر میں دل بار بار ہو بھی چکا
قصور وار سزاؤں سے جب ہیں محروم — شکستِ دل سے تغیر کی عتاب ہو بھی چکا

ہائے اس دوریٔ منزل پہ یہ اندازِ خرام — کارواں موج، واں سیل رواں ہو جاتا
یہ بھی اچھا ہوا تجھ پہ نہ کھلا رازِ حیات — سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہو جاتا
اک طرف موت ہے اک سمت ہے تو میں جاتا — ہاں تو پھر فیصلہ سود و زیاں ہو جاتا

ہر انقلاب تماشہ ہے بدلوں کے لئے — نہ سوفانہ وفادار ہم تو کچھ بھی نہیں
کہاں وہ گرمی گفتار ہم ہی سب کچھ ہیں — کہاں یہ سردیٔ کردار ہم تو کچھ بھی نہیں
ادھر جو چھاؤں سی دیکھی تو آکے بیٹھ گئے — لرزتا سایۂ دیوار ہم تو کچھ بھی نہیں

یہ کمال سادگی ہے کہ مقام بے نیازی — مرا کھیل سنگ باری مرا کام شیشہ سازی
وہ تباہ زور بازو یہ خراب رسم تقویٰ — کہ حجم نزا سپاہی تو عرب نرا نمازی
تری تیغ خوں سے رنگیں تری لاش خوں سے رنگیں — یا یہی داقعات خونیں نہ شہید تو نہ غازی
یہ جو ہی کی نعمت ہے شرعی تو کی عصمت — جو یہ ہو تو دینداری یہ نہ ہو تو دین بازی
حفیظ ان تمنوں سے توبہ تو ہزار بار کرلی — مگر اس جدیدیت کا کوئی وصف امتیازی

ابھی کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں — لٹ گئی عصمت بہار کہاں
درد ہی چین سے نہیں رہتا — دل میں گنجائش قرار کہاں
سہہ سکے بار آشیانے کا — شاخ گل اتنی پائیدار کہاں

چاہے تن من سب جل جائے — سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے — دل ٹوٹے آواز نہ آئے
دنیا کا اپنا نا ہی کیا — کانٹے اپنے پھول پرائے
کاش ہمارا فرضِ محبت — عیشِ محبت پر چھا جائے

تعمیر پسند تحریک غزل کو کس رخ پہ لے جا رہی ہے اسکا اندازہ اوپر کے انتخاب سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ غزل کو جس خلوص اور دل سوزی سے حفیظ صاحب نے اپنایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ تعمیر پسند غزل گو شعراء میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ تعمیر پسند غزلوں کا جو انتخاب اوپر پیش کیا گیا ہے اُسے سامنے رکھ کر کئی ایسے گوشے اجاگر کئے جاسکتے ہیں جہاں نئے نظریے کو سامنے رکھ کر نئے نئے تجربے کئے گئے ہیں مگر اسطرح بات خاصی طویل ہوجائیگی اسلئے انکی جانچ پرکھ کو قارئین پر چھوڑ کر حفیظ صاحب کے ایک تنقیدی مقالے سے میں وہ حصہ نقل کرتا ہوں جہاں انھوں نے غزل اور اسکے فن کے بارے میں اپنا نظریہ واضح کیا ہے۔

"اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے غزل اور نظم کا فرق ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ غزل کلیات سے بحث کرتی ہے جبکہ نظم کا زیادہ تعلق جزئیات سے ہے غزل کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ کسی جذبہ، احساس، یا خیال کو ٹھہر ٹھہر کر بیان کرنا نظم کے لئے جتنا صحیح ہے غزل کے لئے اتنا ہی غلط ہے غزل کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اشاروں کنایوں سے گذر کر ان اشاروں کا . . صاف صاف نام لینے سے حتی الامکان گریز کرتی ہے جو واقعی زیر بحث ہیں اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی لطافت اور آفاقیت کھو دے گی اس کی تمثیلی انداز میں گفتگو کرنے کی ادا اسے زمان و مکان کی حدود سے بالاتر کر دیتی ہے۔"

اسی مقالے میں حفیظ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"غزل کے ذریعہ ہم اپنا مخصوص پیغام تشریحات اور توضیحات کے بغیر محض اشاروں کنایوں میں دوسروں

تک پہنچا سکتے ہیں اور ان اشاروں کنایوں کے صحیح مفہومات
متعین کرنا خود غزل کا کام نہیں بلکہ دوسری اصناف
ادب اور اس سوسائٹی کا کام ہے جو ادب کو حقیقی اقدار
حیات کا علمبردار دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر آیاتِ الٰہی کے غلط
مطالب نکالے جائیں تو حق شناس گروہ اصل عبارت میں
اضافہ کرنے کے بجائے ان آیات کا صحیح مفہوم اپنے لٹریچر
اور عمل کے ذریعہ پیش کرے گا تاکہ حقیقت سب کے سامنے
آجائے۔"

غزل کے رموز و علائم کا صحیح پس منظر کیونکر اجاگر کیا جا سکتا ہے؟
اس پر بھی حفیظ صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں
کچھ مشورے بھی دیے ہیں جو آج بھی تعمیر پسند نقادوں کے لئے قابل غور ہیں
مناسب ہوگا اگر مقالہ کے اس حصہ کو یہاں بجنسہ پیش کر دیا جائے۔

"اس موقع پر آپ سوال کریں گے کہ اگر ہم غزل میں حقائق کو
کھول کھول کر بیان کرنے اور خرابیوں پر تنقید کرنے سے
باز ہیں تو لوگ ہماری غزلوں کے اشعار کا وہ مفہوم نہ سمجھیں گے
جو ہم سمجھانا چاہتے ہیں یہ اندیشہ اپنی جگہ درست ہے مگر اسکا
دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے مقررین، صحافی، ناولسٹ
ڈرامہ نگار اور دوسرے نثر لکھنے والے غزل کے اشعار کو
اپنی تخلیقات میں اس سلیقہ کے ساتھ اور باموقع استعمال
کریں کہ پڑھنے والوں کے ذہن نشین وہی مطالب ہو جائیں
جو تعمیر پسند شاعروں نے ان میں جان بوجھ کر رکھے ہیں۔
تنقیدی مقالوں میں بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے
تو تغزل پسند حلقہ کا انداز فکر یقینی رفتہ رفتہ بدل جائے گا
تیسرے یہ کہ اسلامی تحریک عملاً جس قدر وسعت اختیار
کرے گی عوام کے دل و دماغ پرانے تصورات سے ہٹ کر
ان مسائل کی طرف رجوع ہونگے جو ہمارے نزدیک زیادہ
اہم ہیں اور اسطرح بھی اسلامی غزل کے لئے بالآخر
ایک سازگار فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس اندازہ کی تائید
میں یہ حقیقت پیش کی جا سکتی ہے کہ آشیاں، صیاد، قفس،
ساقی، محفل وغیرہ کے معنی آج پہلے سے بہت کچھ بدل گئے
ہیں واقعات کے خاموش مفسر نے ان الفاظ کی اتنی واضح
تفسیر کی ہے کہ ابہام کی گنجائش نہیں رہی۔"

("موضوعات غزل کی تنقیح" ایک جائزہ معیار اپریل ۱۹۵۳ء)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ صاحب غزل کے فنی اور
موضوعی مسائل پر کیسی گرفت رکھتے ہیں۔ جمیل احمد فاروقی نے اپنے ایک مقالے
"ہمارے اسلام پسند شاعر" میں حفیظ صاحب کے بارے میں جچی تلی رائے کا
اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"صنف ادب کے اس تنگ دائرے میں کلاسیکل اور روایتی
[illegible] کو پورا لورا لیا۔ لکھتے ہوئے بھی ہمیں حفیظ کے رنگ
تغزل میں جو بے ساختہ شعریت، لطافت و پاکیزگی، سادگی
و پرکاری، گہرائی اور مقصدیت نظر آتی ہے وہ بہت کم غزل
گو شاعروں کے یہاں ملتی ہیں اسکی غزلوں میں داخلی اور
خارجی کیفیات کا ایک ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے جو ذہن پر
ایک گہرا نقش اور دائمی تاثر چھوڑ جاتا ہے اور یہی تمام
خصوصیات حسن [illegible] اسلوب و طرز ادا کے ساتھ مل کر
غزل میں اشعار کا جامہ پہنتی ہیں۔ اسکا اگر ایک سرسری جائزہ
لے لیا جائے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ حفیظ کا فن ایک مخصوص
انفرادیت کا حامل ہے۔"

(منقبت نمبر ماہنامہ معیار ۱۹۵۳ء)

اسی کے ساتھ ساتھ تسلیم [illegible] فاروقی نے حفیظ صاحب کے کلام میں
خستگی کے عناصر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو قابل غور ہے۔

"کبھی کبھی حفیظ کی غزلوں میں زندگی کی تلخ کاموں کا احساس
اور خستگی کا عنصر غالب ہو جاتا ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز
شدید مایوسی اور قنوطیت کی شکل نہ اختیار کر لے۔ اس
پہلو پر اسے ہر وقت گہری نظر رکھنی چاہئے فانی بدایونی مرحوم
کی مثال آنکھوں کے سامنے ہے۔"

اسمیں شک نہیں کہ کہیں کہیں حفیظ صاحب کے یہاں ایسے اشعار
ملتے ہیں جن سے غم انگیزی ٹپکتی ہے۔

اللہ رے اس ہوس تمنا کی بیکسی | دل بھی کبھی کبھی جسے پہچانتا نہیں
کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظ | گدگدا کر رلا گئی دنیا
ہائے وہ نغمہ جس کا معنی | گاتا جائے روتا جائے
بزم طرب میں آج ذرا ہم بھی ہو گئے تھے نغمہ سرا | لیکن ایسی چیخوں کی ساز سے کیا نکلی آواز

مگر غم کا اظہار شعر کو بلند ترین جذبات کا حامل بھی بنا سکتا ہے۔
ضروری نہیں کہ غم ہمیشہ مایوسی اور قنوطیت ہی کا پیش خیمہ ہو اور فراری ذہنیت
پیدا کرے۔ وہ سوز و گداز کا قالب بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ایک انگریزی شاعر
نے کہا ہے:۔

Our sweetest songs are those
that tell the saddest thought.

سوز و گداز اچھی شاعری کا جزو اعظم ہوتا ہے اسکو قنوطیت سے
کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اسمیں دوسرے کے دکھ کا احساس شامل ہوتا ہے۔
قنوطیت اور فراری ذہنیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی اپنی مشکلات
کو سمجھ نہیں پاتا اور اسکے سامنے مستقبل کی روشنی غائب ہو جاتی ہے سچا غم
اگر بلند مقصدیت کی آغوش میں پرورش پاتا ہے تو اس سے حیات میں لطف
اور زندگی میں گرمی آتی ہے اس سلسلہ میں "فرار" اور "ہجرت" کی وہ اخلاقی
توجیہات قابل مطالعہ ہیں جو ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے مقالے "ادب کا مقصد"
(انتقادیات حصہ اول "نگار" لکھنؤ) میں ملتی ہیں وہ کہتے ہیں:۔

"تو گویا گریز کی دو قسمیں ہوئیں ایک گریز وہ جو محض برائے گریز
ہو ایک گریز وہ جو قوت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے جسے ہم
ہجرت کہتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہجرت کا درجہ
گریز سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ یہ قوت دینا ہے۔ حاصل کرنے
کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ ذہن پھر تازہ اور لیس ہو کر پھر
زندگی کی کشمکش کو سر کرنے کے قابل ہو جائے۔"

درحقیقت یہ فنکار کا نظریۂ حیات ہوتا ہے جو اسکی ذہنیت کو بناتا ہے
حفیظ صاحب نے جس نظریہ کو اپنایا ہے اسمیں یقیناً فرار اور قنوطیت کی
گنجائش نہیں ہے۔ ویسے ان چند اشعار سے جو نظر پیش کئے گئے
ہیں اور سوز و گداز کے حامل ہیں حفیظ صاحب کے کلام میں ایسے اشعار
بکثرت نظر آتے ہیں جن میں غم و امید اور ہم میں مسکرانے کی کیفیت
ہے جس غزل کی زمین ہم تو کچھ بھی نہیں ہے سے اگر کوئی قنوطی اسے

کہتا تو تمام کے تمام اشعار اسی رنگ میں ہوتے مگر حفیظ صاحب نے طنز
سے ان اشعار میں قنوطیت کے بجائے تحریکیت کے امید افزا عناصر شامل
کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ایک نظم "داغ" میں جو رفیقۂ حیات کی موت سے
متاثر ہو کر کہی گئی ہے غم کا جو تصور ملتا ہے وہ تعمیری کہا جا سکتا ہے یہ تجربہ
مرثیہ کی صف میں تعمیر پسند نقطۂ نظر سے مستقل اہمیت رکھتا ہے

مرے کاشانے کے ہر ہر گوشۂ تاریک میں
جیسے تم موجود ہوتے ہو نظر آتے نہیں
آج کیوں راہ صداقت میں بصد عزم و ثبات
ہر قدم پہ حوصلہ افزائی فرماتے نہیں
پھر محبت میں تماشہ بن گیا میرا وجود
پھر اسی انداز سے کیوں آ کے سمجھاتے نہیں
پھر ملامت کا نشانہ بن گئیں قربانیاں
تم کہاں ہو؟ "آفریں" کے پھول برساتے نہیں

ایک شعر میں البتہ شدید قسم کی ہیجان کے اثرات ملتے ہیں ؎

یہ زندگی بھی حفیظ آہ کتنی ظالم ہے — یہاں خیال کی دنیا میں بھی بسا نہیں

مگر یہ شعر اسوقت کا ہے جب تعمیری ادب کی تحریک وجود میں بھی نہیں
آئی تھی رہی سوز و گداز کی بات تو واقعی جب حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ

بزم طرب میں آج وہ ماتم کئے ہوئے تھے نغمہ سرا
لیکن ایسی چیخوں کی ساز سے کیا ملی آواز

تو عام طور سے ذہنی تاثرات ہو سکتے ہیں جن کا اظہار رسیل احمد فاروقی
نے کیا ہے لیکن حفیظ صاحب اپنی چیخوں کا بھی الگ سوچا سمجھا مقصد رکھتے ہیں
چیخیں بے معنی نہیں ہیں اس ناگفتہ بہ دور میں جبکہ دل تھک ہار گئے ہیں
چیخوں ہی کی ضرورت ہے۔ شاید آپ کی بے حسی اور غم کے نزاع سے کچھ چونکا
سکیں ؎

مغنی تیرے نغموں نے تو مدہوشی بڑھا دی ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

(حفیظ)

اصغر علی عابدی

مغربی ادب کے تین دَور

تمام دُنیا کا موجودہ ادب مغربی ادب کے زیرِ اثر ہے اس لئے جبتک ہم مغربی ادب کا جائزہ نہ لیں اور یہ نہ دیکھیں کہ وہ کس ماحول میں پروان چڑھا۔ وقت کی کونسی ذہنی اور فکری تحریکوں نے اسکو غذا بہم پہنچائی اور سماج کے کس ڈھانچے سے وہ متاثر ہوا، اسوقت تک ہم موجودہ ادب کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ کسی ادیب اور فنکار کو جانچ سکتے ہیں

مغربی ادب کو باسانی تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قدیم ضابطہ بندی کا عہد (Classicalism)
۲۔ رومانیت کا عہد (Romanticism)
۳۔ جدیدیت کا عہد (Modernism)

اگرچہ ان تین مختلف عہدوں کو بھی بعض لوگ الگ شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں لیکن مغربی فکر کے راستے کی مجموعی نشاندہی کے لئے یہی تین اصطلاحات کافی ہیں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی تقسیم کی جاسکتی ہے تو وہ جدیدیت اور کلاسکیت ہیں ورنہ رومانیت کی تقسیم محض سطح بینی کا نتیجہ ہوگی سطح بینی جذبات اور لذتیت ہر زمانے کی رومانیت کا ورثہ ہے کلاسکیت میں دراصل کھلے کھلے دو عہد پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جسکا تعلق براہ راست الہامی کتابوں سے ہے، دوسرے وہ جو ان الہامی کتابوں سے ماخذ کردہ بلکہ مسخ شدہ خیالات پر مبنی ہے۔ لیکن جس کلاسکیت کا تعلق الہامی کتابوں سے ہے۔ اس کو کسی طرح بھی مسخ شدہ افکار کی کلاسکیت سے نہیں ملایا جاسکتا اسی لئے زیادہ بہتر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلاسکیت کے پہلے عہد کو اس عہد کا جز ہی بتایا جائے۔ یہ عہد تو انسانیت کا ابدی ورثہ ہے اور جو لٹریچر اپنی اصل حالت میں اسکے ساتھ وابستہ ہے اسکے اندر ایسی ابدیت، دوام اور تازگی ہے کہ اسکی مثال انسانوں کے تخلیق کردہ کسی ادب میں نہیں ملتی اس لئے ادب میں کلاسکیت، قدامت۔ اور پرانا کے الفاظ کو مسخ شدہ الہامی خیالات کے عہد تک محدود کردینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ان کا اچھی طرح سے پوسٹ مارٹم کیا جاسکے۔

جدیدیت میں بھی واضح طور پر دو رجحان ملتے ہیں۔ وہ دو دور شامل ہیں۔ ایک وہ جو مسخ شدہ مذہبیت اور رومانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے یا اسکے بطن سے پیدا ہوا ہے دوسرا وہ جو اس پورے دور کی نفی کرتا ہے یعنی مسخ شدہ مذہبیت (کلاسکیت)، رومانیت اور انکے توسل سے پیدا شدہ " مادیت " تینوں کو رد کرتا ہے اور انسانیت کی ابدی قدروں اور حیات کے دائمی ورثہ پر اپنے آپ کو پروان چڑھاتا ہے۔ لیکن جدیدیت کی اصطلاح چونکہ شروع ہی سے مادیت پسندوں بالا ذہنیت پسندوں کے لئے بولی جاتی ہے۔ اور یہ انھیں کی ایجاد ہے اسلئے اسکو انھیں کیلئے استعمال کرنا بہتر ہے۔ لیکن جدیدیت کے اس دور کی پیدائش سے قبل جب کلاسکیت۔ اور رومانیت سے بغاوت کا احساس پیدا ہوتو فرد کچھ ایسی قدریں اُبھر گئیں جن کو جدا گانہ مقام دیا جاسکتا ہے۔ اور انکے عہد کو ایک الگ عہد کہا جاسکتا ہے یورپ میں حقیقت پسندی (REALISM) کا حرچا انھیں دنوں ہوا۔ لیکن بعد میں یہ حقیقت پسندی لا ذہنیت اور مادیت میں کھوگئی اور اسکی تعبیر ہی بدل گئی جیسے قدیم ہندوستان کا بدھ انقلاب آگے چلکر برہمنی مت میں کھوگیا اور اسکا مقصد ہی بدل گیا۔

اسطرح ہم ان مختلف اصطلاحات کو یوں دیکھ سکتے ہیں۔

۱۔ کلاسکیت۔ مسخ شدہ الہامی خیالات کی عکاسی۔
۲۔ رومانیت: جذباتیت لذتیت اور سطح بینی۔
۳۔ حقیقت پسندی۔ کلاسکیت اور رومانیت کے خلاف بغاوت۔

(دیگر مثبتی بنیادوں پر)

۴۔ جدیدیت: لا ذہنیت اور مادیت۔

ان میں کلاسکیت کا آج کے ادب پر کوئی خاص اثر نہیں موجودہ ادب کی اوپری ساخت (SUPER STRUCTURE)

تھا بالکل ہی بدل گئی۔ البتہ اندرونی مغز (INNER KERNEL) اب بھی ویسا ہے اسلئے اسکی اہمیت ہے لیکن اگر ہم رومانیت، حقیقت پسندی اور جدیدیت کا تجزیہ کریں تو آپ سے آپ اس اندرون کی کارفرمائی سامنے آجاتی ہے اسی لئے اس جگہ کلاسکیت سے براہ راست کوئی بحث نہیں۔ اب رہا وہ عہد جو براہ راست اصل الہامی لٹریچر سے تعلق رکھتا ہے یا جدید زمانے کے ابدی حقائق پر مشتمل ادب کا عہد ہے۔ تو وہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ لیکن اس عظیم ادب کی طرف اقدام سے قبل ہمیں اسکے مقابل کے ادب کو سمجھ لینا چاہئے۔ اسی لئے ہماری بحث مغرب کے صرف انھیں تین ادوار پر مشتمل ہے۔

۱۔ رومانیت۔

۲۔ حقیقت پسندی

۳۔ جدیدیت۔

رومانیت:۔ نئے ادب میں اگرچہ مستقبل پسندی (FUTURISM) اور حقیقت پسندی (REALISM) کا شعور اجاگر ہے، زمانے کے بدلتے ہوئے تمدنی اور سیاسی حالات، اور نئی نئی تحریکوں نے ادب کو اسطرف نہایت شدت سے دھکیل دیا ہے۔ لیکن اس عام رجحان کے باوجود رومانیت (ROMANTICISM) بھی پوری شان اور سطوت کے ساتھ جلوہ گر ہے ہر چند کہ آج کا ادیب اپنی زبان سے یہی کہتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصدی، اور واقعیت پسندانہ ادب پیش کر رہا ہے لیکن اسکا قلب اور اسکی روح چپکے چپکے اس کے ادب میں رومانیت اور جذباتیت کی رنگ آمیزی کرتے چلے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ اسکی تمام تر آزادروی اور باغیانہ (REBELLIOUS) طرز نگارش جذباتی اور رومانی معنوں میں کھو گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گزشتہ دور میں رومانیت کی شکل و صورت کچھ اور تھی اور آج کچھ اور ہے، پہلے وہ بلبل کے نغموں، آبشاروں کے سرود، پھول کی پتیوں، اور محبوب کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھی۔ مگر آج وہ، مزدور کی پسلیوں، سڑکوں کے گرد و غبار، روٹی کے انبار اور نت نئے مسائل کے ہمراہ ناچتی ہے۔ آج بھی رومانیت نئے مقاصد اور بدلے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ اور نغمہ سرا ہے لیکن اسکی سرشت اور خصوصیات میں کوئی فرق نہیں آیا، جو خون اسکی رگوں میں پہلے دوڑتا تھا وہی اب بھی دوڑتا ہے، دیوانگی، جنون، اور مجذوبانہ انداز گفتگو کی جو لطافت اسمیں پہلے ہوا کرتی تھیں وہی اب بھی پائی جاتی ہیں۔

۱۔ اصل رومانیت کے ادب کے ساتھ اسطرح چپکے رہنے کے

مخصوص اسباب ہیں اور جبتک بنیادی طور پر وہ اسباب برقرار رہیں گے اسکے "ہمزاد" میں کوئی فرق نہیں آئیگا، چاہے نئے زمانے کا ادیب اپنے تمام شعور اور ادراک سے کام لے کر اسکو ادب سے خارج کردینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے، وہ اسکی تمام کوششوں کے علی الرغم کسی طرح جدا نہیں ہوسکتی۔ ہمیں سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کرنا ہے۔

موجودہ ادب کی سرزمین پر رومانیت کا نزول حقیقت میں یورپ کے آسمان سے ہوا ہے، اگرچہ عہد وسطیٰ کے عرب، ایران، ہندوستان، مصر اور چین و جاپان کو بھی اس میں دخل ہے، لیکن یورپ نے اس کام میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، یورپ کے سیاسی اور مادی تفوق، کے ساتھ ساتھ جہاں اسکے دوسرے نظریات اور افکار نے زندگی کے مختلف شعبوں پر قبضہ کرلیا وہیں ادب بھی انکی دستبرد سے نہ بچ سکا اور خصوصاً ان علاقوں کا ——— جن کو براہ راست یورپی اقوام کی غلامی کا شرف حاصل رہا ان ممالک کے ادیب اور شاعر یورپ کی مادی اور سیاسی غلامی کے علاوہ انکی ذہنی اور فکری غلامی میں بھی مبتلا ہوگئے

۱۸۳۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کا زمانہ یورپ میں اس رومانیت کے عروج کا دور ہے یہ رومانیت یورپ کی اٹھارھویں صدی کی رومانیت سے بہت کچھ مختلف تھی۔ اٹھارویں صدی میں اگر محض مناظر قدرت، گل و بلبل اور مذہبی عقائد اور جذبات سے گلستان ادب کی آبیاری کی جاتی تھی تو اس دور میں ابھرے ہوئے عقلی نظریات نے گرجاؤں اور کلیساؤں میں بجنے والی گھنٹیوں، مذہبی رسومات اور عبادات کے خلاف ذہنوں میں ہلچل مچادی تھی جسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ادیبوں اور لکھنے والوں کے وہ فطری جذبات عبودیت جن کو وہ نمازوں اور دعاؤں کے واسطے سے صرف کیا کرتے تھے، خمر پرستی، عیش پرستی، حسن پرستی، اور مختصر طور پر ——— وجدان پرستی کی شکل میں نکلنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ عیسائی مذہب کے افکار غیر عقلی تھے، انسانیت کے لئے مضر تھے، اسکی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکاتے تھے قدم قدم پر اسکے آگے کانٹے بچھاتے تھے لیکن انکے بدلے میں جو خیالات و نظریات "میدان" میں آئے وہ کون سے عقلی اور اصلاحی تھے؟ زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر انھوں نے کونسا تیر مارا؟ انھوں نے کس وقت اعلیٰ مقصدی ادب کے لئے راستہ صاف کیا؟ اور کیسے صحت مند طریقے پر انسانی مزاج کے جذباتی عناصر اسکی عبودیت پسندی

روح پسندی کی تسکین کو ان افکار کے عمل در آمد کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ لوگ جو کچھ دن بیشتر عیسائی پادریوں کے دام میں گرفتار تھے، بادشاہوں کو خدا کا فرستادہ سمجھ کر انکے آگے رکوع و سجود کرتے تھے، ــــ ان کو چھوڑ کر، ـــ حسن اور دلفریبی، دلی لذت اور ذہنی حظ کے "بتوں" کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ پارلیمنٹوں، جمہوری اداروں، دفتروں کارخانوں، کے لوگ اپنے خالی اوقات میں کسی رومان کی تلاش میں سرگرداں اور حیران رہنے لگے۔

سب نے ان دو باتوں کو بالکلیہ تسلیم کر لیا تھا کہ:-

(۱) 'جذبات' اور 'احساسات' انسان کی رہنمائی ہمیشہ 'حق' اور 'صداقت' کی طرف کرتے ہیں۔

(۲) قدیم 'اصول' اور 'ضابطہ' کی باریک بینی سے کام لینے کی ضرورت نہیں مختصر طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر 'حسین' اور 'خوبصورت' شے ـــــ قیمتی اور مفید بھی ہوتی ہے۔

یہ تھا نیا 'ادبی دین' اور یہ تھے اس کے کلمات جامعہ۔ 'جذبات' احساسات اور وجدان کو جب یہ بلند مقام حاصل ہوگیا اور ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو شعار بنا لیا۔ یسوع مسیحؑ کے ماننے والوں اور معصوم مریم کے شیدائیوں نے اپنے قدیم گرجاؤں اور کلیساؤں کے بالمقابل آزادانہ جنسی تعلقات، جذبات پرستانہ سیاست اور دنیاویت کی تلقین کرنے والے ادیبوں کے نئے 'کلیسا' اور نئی عبادت گاہیں بھی تعمیر کرنا شروع کر دیں، انگلستان میں یہی دور تھا جبکہ اسکی شاعری نے ایک کروٹ بدلی، اور شیلے، ورڈز ورتھ، کیٹس، اور بائرن کی قدیم طرز کی نظموں کی بجائے الفریڈ ٹینی سن (ALFREDTENNYSON) اور رابرٹ براؤننگ (ROBERT BROWNING) کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ براؤننگ نے اگرچہ ورڈز ورتھ کی قائم کردہ روایات کی پیروی کی، لیکن اس نے قدیم "فطرت پرستی" کو اپنے زمانے کے اصول و نظریات سے ہم آہنگ کر دیا۔ وہ اپنی پرانی "قدروں" کو لے کر زندگی کے نئے اور انجان راستوں پر دوڑ پڑا۔ اسی طرح ٹینیسن نے انگریزوں کی حب الوطنی ایثار اور قربانی کے گذشتہ زمانے کے واقعات کو تمثیلوں کے ذریعہ مسحور کن اور طلسماتی زبان میں پیش کیا۔ اور ایک جذباتی طریق اصلاح کا تعارف کرایا افسانے (FICTION) اور ناول میں بھی عظیم تغیرات ہوگئے، تھیکرے (WILLIAM - MAKEACE THACKFRAY) - کے معاشرتی رومان "نیوکمز" (THE NEWCOMES)، چارلس ڈکنس (CHARLES DICKENS) کی "TALE OF TWO CITIES" "DAVID COPPER FIELD" "PICWICK PAPERS" ـــــــــــ

اور دوسری کتابوں میں لطیف رومانی قصے اور انداز فکر کے ذریعہ اپنے زمانے کے معاشرتی حالات کی عکاسی کی گئی۔ پھر یہی حال ریڈ (READE) اور جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT) جیسے ادیبوں کا ہے، جو اسی دور کی پیداوار ہیں ان ناول نویسوں کے علاوہ میکالے (MACAULAY) نیومین (NEW MAN) اور رسکن (RUSKIN) جیسے "علمی چیزیں" لکھنے والوں نے بھی اپنی تحریرات کو رومانیت اور ادبی مٹھاس کی چاشنی سے شیریں بنایا۔ اور خالص ٹھوس باتوں کو بھی جذباتی انداز میں پیش کیا۔

انگلستان کی طرح فرانس میں بھی وکٹر ہیوگو (VICTOR HUGO) کے ڈراموں، ناولوں، اور نظموں، الکساندر ڈوما (ALEXANDRE DUMAS) کی کہانیوں، ناولوں اور جذباتی تحریروں، بلزاک (HONORDE BALZAC) کی پر جوش اور اونچے طبقوں کی مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کرنے والی کتابوں اور مشہور ناول نویس عورت ژرژ ساں (GEAGE SAND) کی غیر معمولی ادبی کاوشوں نے جن میں زیادہ تر وقت کے اخلاق، اور سماج کے خلاف محض جذباتی اور سلبی طور پر تنقید کی گئی تھی، اپنی متحدہ قوت سے تمام یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اسی دور میں جرمنی، روس اور اٹلی میں بھی یہ نیا ادبی رجحان ترقی پذیر تھا لیکن انگلستان اور فرانس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا تھا انگلستان اپنی دستوری تبدیلیوں، سیاسی برتری، اور مذہبی تغیرات کے باعث ابھرتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور فرانس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد سے لوگوں کے ذہنوں پر اسطرح قبضہ کر لیا تھا کہ جو چیز وہاں سے نکلتی اُسے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا جاتا۔ انیسویں صدی کے اس دور میں ان ممالک میں جتنے زبردست لکھنے والے پیدا ہوئے اعتقادی طور پر اپنے دور کے مرحلے ہوتے سیاسی معاشی اور مذہبی، حالات کے تحت عمل پیرا تھے زمانے کا تکرار ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کی تحریرات کا THEME یا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔

قدیم مذہبی نظام کا زوال جسکا آغاز ترک، توحید خالص سے گریز، خدا پرستی کے بجائے خدا سے عام انسانوں کی طرح عشق، اور وحدت الوجود کے خود ساختہ دینی تصورات کی وجہ سے شروع ہوچکا تھا ادب میں رومانیت پسندی کا اصلی محرک تھا۔ پھر اس گرتے ہوئے نظام پر اسپیس سے آتے ہوئے عقلی علوم نے بھی ایک ضرب لگائی تھی۔

لیکن یہ محض ادھچا دانتھا اور اسے بینترا بدل کر قبول کیا گیا تھا اس لئے غیر عقلی مذہبی قدریں مجروح ہوکر بلبلا تو اٹھیں مگر انکے مقابلہ میں عقلی مذہبی قدروں پر نئے سماج کا کوئی نقشہ سامنے نہ آیا۔ اس لئے ایک عام ذہنی مزاج اور افرا تفری پھیل گئی۔ اور رومانیت نے جنم لیا۔

یہ ہے یورپ میں رومانیت یا ادبی جذباتیت، کی مختصر داستان، اس بحث کی منتشر کڑیوں کو ایک بار پھر جوڑ لیجئے:۔

(۱) انیسویں صدی کی رومانیت دراصل اس دور کی مذہبیت اور عقلیت پسندی کے درمیان کشمکش کی مظہر تھی۔

(۲) عیسائیت کے وہ معتقدات جو انسانی فطرت کی جذبات پسندی عبودیت پسندی اور عافیت پسندی کی تسکین کرتے تھے، جب عقلیت کی ضرب سے پاش پاش ہونے لگے تو لامحالہ یہی جذبات حسن پرستانہ نغموں، افسانوں اور روزمرہ کے واقعات کی پرستش، اور "عبادت" کی شکل میں ظاہر ہوگئے اور انھوں نے ایک نئی ادبی تحریک رومانیت (ROMANTICISM) کو جنم دیا۔

(۳) مذہبیت کے ساتھ ساتھ جب مذہبی پیشواؤں اور علماء کی اہمیت گھٹ گئی تو شخصیت پرستی کے پچھلے جذبات دوسری طرف منتقل ہوگئے اور زندگی کے ہر موڑ پر ایک محبوب کی تلاش ہونے لگی۔

(۴) یورپ والوں اور خصوصاً انگلستان اور فرانس کی بڑھتی ہوئی عالمی سیادت کی بنا پر تمام دنیا اور انکی نوآبادیات مقبوضات میں ان کے خیالات اور افکار بغیر کسی معمولی سعید کے قبول کر لئے گئے۔

ہندستان کے ادیب اور لکھنے والے جنکی ذہنیت، انگریزوں کی آمد سے قبل ہی زخم خوردہ اور شلی ہوگئی تھی انکی آمد کے بعد اپنی رہی سہی سکت بھی کھو بیٹھے۔ انگریز جب یورپ سے آئے تو اپنے ساتھ ٹینی سن۔ براؤننگ، تھیکرے ڈکنس، جارج ایلیٹ میکالے، نیومن۔ رسکن ہیوگو، دوما بالزاک، زدر روسو، اور اسی طرح کے دوسرے ادیبوں اور فلسفیوں کو بھی لیتے آئے اور ہندوستانیوں نے جس طرح انگریز کی تلوار کے آگے اپنی گردنیں ڈال دیں اسی طرح اپنے کمزور اور بوسیدہ کردار کی بنا پر ان لوگوں نے اپنے دماغ، زبان، اور قلم کو بھی انگریز پر نچھاور کر دیا۔ اور اس کے بعد اگر انھوں نے لکھا تو انگریز کے "مصنوعی" قلم سے سوچا تو انگریز کے کرایہ کے ذہن سے، اور کہا تو انگریز سے مستعار لی ہوئی زبان سے یہ ہیں انگریزی دور کے ہندوستانی ادیب! جنکی ایک کھیپ ابھی تک چلی جا رہی ہے۔ انگریزوں کی غلامی میں رہ کر انھوں نے بھی اپنے ملک کے مذہب اور ادیان کے خلاف اسی طرح علم بغاوت بلند کیا جسطرح انیسویں صدی کے ادیبوں، اور فلسفیوں نے یورپ میں کیا تھا لیکن یورپ میں اگر اس بغاوت کا سبب یہ تھا کہ عیسائیت کے عقائد وخیالات اپنے اندر کچھ بھی مذہبیت اور عقلیت نہیں رکھتے تھے تو ہندوستان میں اس بغاوت کا سبب محض انگریز کی ذہنی غلامی اسکی غیر ارادی پرستش، اسکی نوکری کا خیال اور اسکے پیدا کردہ ماحول میں رہ سہ کر۔ زیادہ سرمایہ دار بننے کی امنگیں تھیں۔ صحیح ہے کہ ہندوستان کے ادیان ومذاہب میں بھی عیسائیت کی طرح جاہلی تصورات اور اعمال گھس گئے تھے اور انکے پیرووں کا عمل بھی محض برائے نام رہ گیا تھا، مگر ان وقت پرست انگریز کے بیٹوں نے مذہبی اصول اور افکار کے علی الرغم کسی حقیقی عقل پرستی (RATIONALISM) کی اساس پر مخالفت کا آغاز نہیں کیا تھا بلکہ انکی حالت تو یہ تھی کہ غلامی اور نکبت کے مارے ہوئے دریوزہ گر ہاتھ میں کاسۂ گدائی لئے گلی گلی انگریز کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے تھے جہاں کسی گھر سے ڈبل روٹی یا کیک کا کوئی سوکھا ٹکڑا مل جاتا جھٹ سے اپنے ہموطنوں میں دوڑے ہوئے آتے اور انھیں وہ ٹکڑا دکھا دکھا کر مرعوب کرتے کہ دیکھو ہمیں انگریز نے کیا دیا ہے؟ پھر چاہے اس ٹکڑے سے ان کا پیٹ بھرتا ہو یا نہ بھرتا ہو، یہ لوگ اپنی غلامانہ ذہنیت اور مفلوج تخیل کی بنا پر خالی پیٹ پر ہاتھ پھیر کے اور مصنوعی طریق پر ڈکار لے کر یہی کہتے کہ چیز جو ہم نے کھائی ہے بڑی لذیذ ہے اور پیٹ تو بالکل ہی بھر گیا ہے۔

موجودہ دور کے ترقی پسند اشتراکی ادیب تو اپنی فکری اور ذہنی فلاکت کے سبب انتہائی پستی اور تنزل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انکی زبان پر اگرچہ "واقعیت پسندی" اور مقصدیت کا کلمہ جاری ہے اور وہ خود کو "مستقبل" (FUTURE) کا پیرو قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ——— ان کے اتنک کے سارے کارنامے محض جذباتی، سطحی اور وقتی بلکہ ہنگامی ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی انقلابی اور اصلاحی نہیں، اُن کا ہر اصول اور نظریہ وقت کے گندے اخلاق میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان فطرتاً جذباتیت کا حامل ہے، اس کی طبیعت اکثر اوقات غیر ارادی طور پر محبت، پرستش اور بے خودی کی طلبگار ہوتی ہے، اب اگر ان اجزاء کا کوئی اچھا مصرف متعین کر لیا گیا۔ اور انسان کی فطری جذباتیت کو کسی سیدھے راستہ پر ڈال دیا گیا تو خیر! ورنہ اسکا ذہن

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

اختر لکھنوی

○

وہ دورِ ہستی نہیں رہا اب جو دورِ ہستی تھا ہم سے پہلے
رہیگا اب نقشِ پا ہمارا تمہارے نقشِ قدم سے پہلے

وہ کیا زمانے کا ساتھ دے گا وہ کیا زمانہ بدل سکے گا
شکست جو کھا گیا ہو خود ہی شکستِ جور و ستم سے پہلے

میں مانتا ہوں کہ تیرے غم میں بڑی ہی رنگینیاں ہیں، لیکن
مجھے غمِ زیست مل چکا ہے تیری محبت کے غم سے پہلے

فریب مجھ کو نہ دے سکے گی تری نوازش تری عنایت
کہ یوں ہی ہوتا ہے لطف تیرا ہر اک پہ جور و ستم سے پہلے

سمجھ رہے تھے کہ رہ پُر خار سے بس اک ہم گذر رہے ہیں
مگر نشانِ قدم بتاتے ہیں لوگ گذرے ہیں ہم سے پہلے

اُنہی کے قدموں میں ہے مسرت اُنہی کو حاصل ہے عیش و عشرت
جنابِ اختر گذر گئے جو حدودِ رنج و الم سے پہلے

ثروتؔ میرٹھی

○

غم کی دُنیا میں کچھ خوشی پائی
جان دینے سے زندگی پائی

بیوفائی کا اُن سے کر کے گلہ
اپنے ہی عشق میں کمی پائی

شمع کی عمر کم سہی لیکن
کتنی نورانی زندگی پائی

ہم سے کیا زندگی کا بوجھ اُٹھتا
مہربانی کچھ آپ کی پائی

غمِ اُلفت کے بعد دُنیا میں
جو خوشی پائی عارضی پائی

اس سے ذکرِ سکونِ ساحل کیا
جس نے طوفان میں زندگی پائی

وہ تو اتنے بُرے نہ تھے ثروتؔ
ہم نے قسمت ہی کچھ بُری پائی

شاکر تسلیم

○
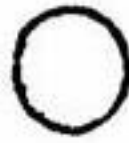
کوئی اِن قافلوں کو پکارے
چل دیئے ظلمتوں کے سہارے

ہوگئی یوں تو دُنیا تمھاری
کاش ہو جائیں ہم بھی تمھارے

خیر گذری ابھی چھین لیتے
مجھ سے ذوقِ نظر یہ نظارے

رہ گئی ساری دُنیا الجھ کر
اب کوئی زُلفِ ہستی سنوارے

بن گئے مُستقل اک سہارا
ٹوٹ کر زندگی کے سہارے

صبح تک شب کی تاریکیوں پر
مُسکراتے رہے چاند تارے

گر یہی ہے کرم اُن کا شاکر
جی چکے بس مُحبت کے مارے

عنواں چشتی منگلوری

پیغامِ امن اور یہ دار و رسن کی بات
اہلِ خرد بھی کرتے ہیں دیوانہ پن کی بات

ناکامیٔ حیات، گوارا نہیں مجھے
رہ جائے کاش عزمِ حوادث شکن کی بات

محفل میں جب ہوا حق و باطل کا تذکرہ
میری زباں پہ آ گئی دار و رسن کی بات

صیاد و باغباں نے کیا ہے یہ التزام
باہر چمن سے چھوٹ نہ نکلے چمن کی بات

ہوتا نہیں ہے کوئی سپردِ جنوں مگر
ہر شخص کی زباں پہ ہے دار و رسن کی بات

معمارِ دورِ نو کی بصیرت تو دیکھئے
اعلانِ حق کو کہتا ہے عہدِ کہن کی بات

عنواںؔ مرے خلوصِ مسلسل کے باوجود
احباب کے لبوں پہ ہے بیگانہ پن کی بات

متین طارق

تنقید پر تنقید

سب سے پہلے تو میں یہ سمجھا دوں کہ تنقید کا لفظ نقد سے نکلا ہے نقد میں ادھار کا کام نہیں ہوتا اسی لئے اس کے صاف صاف معنی ہوئے کھری کھری کہنا چاہئے کسی کو برا لگے یا اچھا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تنقید کا صحیح مفہوم نشتر زنی سے ادا ہوتا ہے اور نشتر زنی بنا ہمت کے ہوتی نہیں جو اہل قلم کی قوت سے باہر ہے۔

لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکر اور ادیب وہ لوگ ہیں جو سوائے تنقید کے اور کوئی کام نہیں کرتے۔ بس اس کے بل بوتے کی بزرگی قائم ہے اور اگر کہیں وہ تنقید لکھنا ترک کر دیں تو کوئی انہیں دو ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا۔ آپ ایسے ویسے ڈبل پیسے سبھی کچھ ہوں مگر بے سود۔ وہاں دو چار معمولی سی تنقیدیں لکھ دیں بس پھر کیا کہنے دنیائے ادب میں آفتاب بنکر چمکیں گے۔ لوگ آپ کی ایسی عزت کریں گے جیسے کسی داروغہ جی کی۔ غرض ایک تنقید کی بدولت شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ گھر بیٹھے کتابیں مفت پڑھنے کے لئے ملتی ہیں۔ اور اخباروں میں نام چھپتا ہے۔

مزید یہ کہ اپنی تنقید میں آپ جتنے ادق الفاظ استعمال کریں گے اتنی ہی وہ مقبول ہوگی۔ جتنی بے تکی باتیں ہوں گی اتنا ہی لوگ سر دھنیں گے۔ اور آپ کو ارسطو کا استاد سمجھیں گے۔ چنانچہ تجربہ کار نقاد کبھی اصل موضوع پر بات نہیں کرتے وہ ہمیشہ مرغ بادنما کی طرح یونان سے ایران اور ایران سے توران کی سناتے ہیں۔ جنکو بعض اوقات پڑھنے والے تو کیا خود وہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے مگر ایسی تنقید کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ یہ بات بڑے دن کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

آج کل نئے اور پرانے فن کی رسہ کشی ہو رہی ہے اس کھینچا تانی میں تنقید کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے ہیں جنکو لمبی تنقید اور چھوٹی تنقید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لمبی تنقید اب نہیں ہوتی یہ حالی مرحوم کے وقتوں میں ہوتی تھی اب تو نہ وقت نہ ایسی قابلیت جو مقدمہ شعر و شاعری جیسی کتابیں لکھیں یا پڑھیں یہ ترقی کا دور ہے ترقی کی سب سے بڑی خصوصیت لمبائیوں کو گھٹانا ہی تو ہے۔ آج کل ہر گویا۔ شاعر اور ہر شاعر ملک الشعرا ہوتا ہے اس کلیہ سے نفع یہ ہوا کہ پچھلے دس برس میں برساتی مینڈکوں کی طرح فن کار خوب پیدا ہوئے اور پیاز کے چھلکوں کی طرح کتابیں بھی پے در پے چھپیں اب حالت یہ ہے کہ مسائل کم ہیں اور لکھنے والے بہت ہیں پڑھنے والے تھوڑے ہیں اور کتابیں زیادہ ہیں۔

پہلے لوگوں کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ جو کچھ لکھیں گے وہ کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے لکھتے تھے اور اکثر تو لکھتے لکھتے مر جاتے تھے۔ لیکن اب چونکہ تنقید کا مفہوم بدل چکا ہے اس لئے یار لوگوں کے دل سے تنقیدی درندوں کا ڈر قطعی جاتا رہا ہے۔ نیز یہ بات کسی سے چھپی نہیں رہی ہے کہ فی زمانہ تنقید نام ہے کسی صاحب کتاب کی منہ دیکھی تعریف کا۔ اگر خدانخواستہ اس کے خلاف کوئی بات ہوئی تو ایسی تنقید چھپنے سے پہلے ہی نذر آتش ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ مصنف اپنے منہ میاں مٹھو کے مصداق خود ہی ایک تنقید نامہ لکھ کر کسی مشہور نقاد کا نام ڈال دیتا ہے۔ جس سے تنقید کا مفہوم بھی پورا ہو جاتا ہے اور کسی کی خوشامد بھی نہیں کرنی پڑتی۔

ویسی باتوں سے نقصان کچھ نہیں ہوتا کیونکہ عام طور سے سب جانتے ہیں کہ تنقید مضامین پڑھنے کے لئے نہیں لکھے جاتے بلکہ صرف کتابوں یا رسالوں کا حجم بڑھانے کے لئے چھاپے جاتے ہیں۔ تاکہ کتاب کا پروپاگنڈا بھی ہو اور ردی بیچتے وقت قیمت زیادہ اٹھے۔

جہاں تک فن اور مقصد کا تعلق ہے وہ سرے سے ختم ہو چکا ہے قلم کی زیادہ تر قوتیں بیکار کے کاغذ کالے کرنے میں لگی ہوئی ہیں اور

مگر کہیں اسکے لئے کوئی مصرف ہے تو وہ صرف اتنا کہ کچھ اُدھار مانگے ہوئے خیالات کو دہرا دے یا پھر اپنی پارٹی اور طبقے کی ہمدردی میں انصاف کی دیوار پھلانگ جائے۔ اس یک طرفہ تماشے کو دیکھنے کے لئے کسی خاص قسم کی عینک کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی تنقیدی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے اُس میں تنقید کم اور طبقاتی جنگ زیادہ ہوگی کیونکہ

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس طرح اپنے کچھ ہمنوا تو پیدا ہو جاتے ہیں۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے بھی یہ نسخہ سب سے سستا ہے ترکیب استعمال کیلئے کسی کتاب یا رسالے سے ایک شعر یا کوئی عبارت انتخاب کر لیجئے پھر یہ دیکھئے کہ مصنف سماج کے کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے سرمایہ دار گروہ سے یا محنت کش مزدوروں سے۔ سجادہ نشینوں میں سے ہے یا لیڈروں میں سے پراتوں میں سے ہے یا نئوں میں سے اور بس پھر اپنے قلم کا سارا زور اُس کی تعریف میں صرف کر دیجئے گا۔ اس کی برائی اچھائی کر کے دکھلایئے۔ دو چار یورپین مصنفین کے حوالے دیجئے الفاظ زوردار ہوں کوئی چیستان کی قسم کا فقرہ ہو تو کیا کہنے اس دردسری کے بعد تنقید کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ نیز آپ ملہم غیب بن جائینگے مصنف سے زیادہ آپ کو مبارکبادی نصیب ہوگی مشاعروں کا موسم ہوا تو صدارت کے دعوت نامے بھی آنے شروع ہو جائیں گے جنہیں فیصلہ آپ کی مرضی پر ہوگا خواہ ان بیچاروں کی تمناؤں کو ٹھکرا دیجئے یا اپنی عنبدی کا ایک اور زینہ طے کر لیجئے۔

سو فیصدی تنقیدیں آج کل اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ اگر ان آسانیوں کے بعد بھی کوئی تعر گمنامی میں پڑا رہے تو قسمت کا کچھ قصور نہیں۔

من کہ یکے از شما

م۔ نسیم

سوکھا ہوا سا جسم، جس پر جوانی کے زمانہ کا لباس۔ تھیلے کی طرح لٹکتا ہوا، ہاتھ کی انگلیوں اور کوٹ کی آستینوں پر چاک کے سفید نشان، کہنیوں کے پاس کہیں کہیں سرخ سیاہی کے دھبے، مضمحل اور بیزار سا انداز گویا ابھی کسی سے لڑائی ہوئی ہے۔ یا جھگڑے کا ارادہ ہے۔ اپنی حالت سے ملتی جلتی سائیکل پر سوار یا پیدل۔ رجسٹر اور کچھ کتابیں یا ہاتھ میں سینے سے لگی ہوئی یا سائیکل کے کیریر پر بندھی ہوئی۔ سفید کالی بھوری یا پھر میل کے رنگ سے رنگی ہوئی کوئی ٹوپی منڈھا ہوا سر، جس پر اُٹھتے ہوئے بال کنپٹیوں کے پاس سے خضاب کی الوداعی جھنڈیاں دکھلاتے ہوئے چہرہ پر زمانے کے ہاتھوں ڈالے ہوئے گہرے گھاؤ جن میں سے خون کے بجائے پسینہ رستا ہوا ناک پر جو زمانہ کی اس دست بُرد سے بچ گئی تھی۔ عینک کے اڈے کا مستقل نشان اور عینک کبھی اس اڈہ پر موجود اور کبھی کوٹ کی اوپر کی جیب سے جھانکتی ہوئی داڑھی کے بال یا خشخشی یا کبھی کبھار گھٹے ہوئے ورنہ رخساروں پر بالوں کی کیلیں نکلے ہوئے۔

آپ پہچانتے ہیں یہ کس کا خاکہ ہے؟

آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے اس قسم کے حلیہ کی ایک شخصیت سے برسوں سابقہ پیش نہ آچکا ہو ——

—— یہ ایک اسکول ماسٹر کی تصویر ہے!

یہی حلیہ کم و بیش اسی زمانہ سے آپ کو روز اسکول کے اوقات میں سڑکوں پر آتے اور جاتے ہوئے نظر آئے گا۔ یہی حلیہ دو تین کے جھنڈوں میں اسکول کے آس پاس کھڑا، دوسروں پر اپنی کوتاہیوں کا بخار نکالتا ہوا ملے گا۔ یہی حلیہ ہر آتے جاتے کی طرف اس انداز سے دیکھے گا گویا کہ مجھے پہچانتے ہو؟ میں تمہارا ماسٹر ہوں ورنہ تمہارے لڑکے کا ماسٹر ہوں۔ میں تمہارے کسی نہ کسی عزیز کا ضرور ماسٹر ہوں۔ مجھے سلام کرو۔ میں عزت کرنے کے قابل ہوں گا اور سچ مچ یہی حلیہ اپنی تنخواہ سے زیادہ سلام وصول کرتا ہے اور آپ سب، ایسے سلاموں کی بخشش کرتے ہوئے اسی طرح کے [illegible] سامنے پاتے ہیں۔

اسی لئے آپ کو غالباً اس تصویر کے پہچاننے میں اپنے تصور کے کسی خاکہ سے ضرور مدد ملے گی —— اب رہا میں۔ تو آپ کے برعکس میں اس حلیہ کو اسی لئے اپنی تفصیل سے بیان کر سکا ہوں کہ یہی حلیہ میرا بھی ہے —— میں بھی ایک اسکول ماسٹر ہوں!

اس بیان میں مجھے اپنے لہجہ میں طنز کا خود احساس ہے (شاید آپ کو بھی ہو) لیکن میرا خیال ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جب پیمانہ قطرہ قطرہ کر کے بھرا جا رہا ہو وہ کبھی نہ کبھی چھلکے گا ضرور چاہے اسے کتنی ہی دیر لگے۔ پھر میں تو اپنی سوسائٹی کا شاید سب سے مظلوم سب سے مفلوک سب سے معزز فرد ہوں۔ اور میری تلخی کی تیزی میرے پیمانہ کی وسعت کے مطابق ہی ہے۔ لوگ سلام کرنے سے زیادہ میری طرف توجہ کرنا یا تو کسر شان سمجھتے ہیں یا بے کار اور میری حالت یہ ہے کہ میں اسے زندگی کا بہترین تحفہ سمجھنے کو تیار ہوں۔ جب کوئی مجھ سے کچھ میرے متعلق بھی پوچھے۔ یوں دوسرے ماسٹروں کی بات دوسری ہے۔ وہ میرا حال پوچھتے ہیں تو اس لئے کہ جب وہ خود اپنا حال کہیں تو مجھ میں سننے کی ہمت موجود رہے اور پھر یہ تذکرہ غم جاناں کا نہیں غم دوراں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ غم جاناں میں تو ہر ایک مبتلا ہے کسی کے لئے وہ نئی بات نہیں ہوتی۔ یوں اگر کوئی شاید یکسر غم ہونے کی غلطی کبھی کر بیٹھے تو پھر میں اسے وہ کچھ بتاؤں —— جو میں یہاں آپ سے کہہ رہا ہوں۔

میری گھریلو زندگی دوسروں سے کچھ انوکھی نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم بدقسمتی میں ہم آپ شاید برابر کے شریک ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح جب صبح آنکھ کھولتا ہوں تو سب سے پہلے بعض دفعہ خدا کی یاد سے بھی پہلے دن بھر کے خرچ کی رقم کانوں پر

کھٹکنے لگتی ہے اور میں کل کی بچی ہوئی رقم جوڑتے ہوئے دعا مانگتا ہوں کہ وہ دن آج ہی کا نہ ہو جب آمدنی، قرض یا پیشگی لینے کا مشورہ دیتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جب قسمت اس بُری طرح میرے حال پر مہربان نہیں ہوتی تو میں نسبتاً خاموشی سے گھر کی ضروریات کو چل کر، پھر کر، بازار جاکر اور بعض دفعہ بہت سے، بالکل ہی چاکری والے کام کرکے پورا کرتا ہوں۔

ایسے موقعوں پر میری اس آرزو میں طوفان کی سی تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ کاش میرے ہاں بھی کچھ نوکر ہوتے۔ اچھا ایک ہی نوکر ہوتا کہ میں کسی پر تو حکم چلا سکتا۔ یوں اسکول میں تو حکم چلاتے ہی گذرتی ہے۔ لیکن کرایہ کا حکم چلانا بھی کوئی حکم چلانا ہے۔ گھر میں چاہے کوئی کتنا چھوٹا سا ہی نوکر ہو مگر حکم صرف اسی پر چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کام صرف اسی سے کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن میری طرح آپ پر بھی یہ بات خوب روشن ہے کہ نوکر گلی میں پڑا ہوا کوئی خالی ٹین کا ڈبہ نہیں جسے جو جی چاہے، یوں ہی اُٹھا لائے (حالانکہ اب ٹین کا ڈبہ بھی گلی میں مفت پڑا نہیں ملتا بلکہ کباڑے کے مال میں بکتا ہے) نوکر رکھنے کے لئے اسے تنخواہ دینا پڑتی ہے اور تنخواہ ایک ایسی شئے کا نام ہے جو روپوں بغیر بن ہی نہیں سکتی ـــ وہی جنس نایاب جو جیب سے نکلتی زیادہ ہے اور آتی کم ہے ـــ چنانچہ یہ آرزو ہمیشہ سرمندۂ تکمیل رہتی ہے۔ اور میں بجائے دل کے جیب پر ہاتھ رکھ کر اک آہ سرد بھرتا ہوں

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آرزو بس یہی ایک ہے آرزوئیں تو ہزاروں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ ایک ایک پہ دم نکلے۔ لیکن جب پوری ایک بھی ہونے میں نہ آئے تو اُن کا ذکر کرنے سے آتشِ شوق کے بھڑکنے کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ میں ان کو دبائے تو بیٹھا ہوں۔

میں نے اپنے آپ کو عقلمند سمجھنے کا ارتکاب کبھی نہیں کیا لیکن مجھے اپنی بے وقوفی کے بارے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اسکول کے بہت سے لڑکے اگر میرے متعلق کچھ ایسی رائے رکھتے ہیں جسے آپ کم از کم مجھ سے سننے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ تو کچھ ایسے بھی سیدھے ہیں جن کی نظروں میں میں کچھ اور ہوں۔ یہ اور کیا ہے؟ یہ بھی میں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ بھی خود ستائی ہی ہوگی۔ مگر اس کا نتیجہ ہے کہ مجھے ایسے لڑکوں کا خیال کرکے اپنے آپ کو اس سے بہت زیادہ حسین اور

نرم دل ظاہر کرنا پڑتا ہے جتنا کہ ہوں ـــ (کمزوری کس انسان میں نہیں ہوتی۔ ہم معلمین اخلاق بھی اس سے خالی نہیں ہیں) لیکن میری اس عظمت کا طلسم اُس وقت دھواں بنکر اُڑنے لگتا ہے جب گھر میں کسی بات پر ناچاقی ہو جاتی ہے اور عین برہمی کی حالت میں اسکول کا وقت ہو جانے کی وجہ سے روانہ ہونا پڑتا ہے۔ اُس وقت اسکول کے طلبا اور ماسٹر تو کیا گلی میں ملنے والے تک جان لیتے ہیں کہ ماسٹر صاحب آج اپنے اصلی رنگ میں ہیں۔ اس دن لڑکوں کی غلطیوں پر میرا غصہ سچا ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں بہت دنوں تک نہیں کر پاتا ـــ اور گھر کی لڑائی کا سبب اکثر یہی ہوتا ہے کہ میں اپنی جلدی میں بازار سے کچھ لانا بھول جاتا ہوں۔ یا پھر کوئی چیز کہیں بھول کر چلا آتا ہوں۔ چیز زیادہ قیمت کی نہ ہو تو بھی میرے لئے جیب سے دوبارہ پیسوں کی ادائیگی۔ ضرور سوہانِ روح ہے۔ اکثر اس غلطی کا غصہ گھر کے کسی معاملہ پر بیوی سے لڑ کر اُترتا ہے۔ اور میں بعد میں پھر دل کو سمجھا لیتا ہوں (کمزوری کس انسان میں نہیں ہوتی اور ہم معلمین اخلاق بھی انسان ہی ہیں)

لیکن نہ معلوم وہ کیا کھٹک ہوتی ہے۔ جو اُس دن مجھے کلاس میں پڑھانے کے بجائے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر میں اس سوچ کو آخیر میں یوں جھٹکنے لگتا ہوں جیسے کوئی گرد آلود راستے میں دامن جھاڑ کر غبار سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ سوچ میرے اندر کچھ جگانے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ ایسی چیزیں دکھانا چاہتی ہے جو میں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر اس سوچ کے آگے میں سپر ڈال دوں تو یہ مجھ سے میری ماسٹری چھڑوا دے گی۔ یہ مجھ سے خود فریبی چھڑوا دے گی۔ یہ میری آرزوؤں کا طلسم توڑ کر کچھ اور کوئی اور بستی بسانے کو کہے گی۔ اور میں! مجھ میں اب یہ ہمت نہیں ہے کہ اس عمر میں یہ سب کرنے کا خیال کرسکوں۔ میں اس سوچ کو ٹھیک مان کر بھی اسے گرد کی طرح دامن سے جھاڑ دینے پر مجبور ہوں۔ میں اس میں اپنے آپ کو قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔

لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی یہ سوچ بڑے لمبے عرصہ کے لئے مجھ پر سوار ہو جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب گھر کی خفگی اور دن بھر کی بدمزگی کے بعد کچھ دن چھٹی کی اطلاع پاکر میں گھر لوٹتا ہوں اور آکر کوٹ اس طرح اتارتا ہوں جیسے تکیہ پر سے

میلا غلاف اتار رہا ہوں ہر شام کو سب سے الگ بیٹھک میں اکیلا حقہ سامنے رکھے چپ چاپ بیٹھا جب میں کش لگاتا ہوں تو یہ سوچ تب چپکے چپکے آکر لاڈلی بیٹی کی طرح میری ہر چیز کو قابو میں کر لیتی ہے میرا تخیل، میرے تصورات، میری آرزوؤں کے طلسم سب اس کے بن داموں غلام بن کر اشاروں پر ناچتے ہیں۔ حقے کے کش کے ساتھ ساتھ دھوئیں کے دل بادل آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دماغ کے پردے بھی یہاں تک کہ یہ سوچ اپنی اصلی شکل میں دانتوں میں انگلی دبائے میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے "سوچ تو۔ کیا تو ماسٹر ہے؟ کیا تو معلم اخلاق ہے؟ کیا تو نے صرف تنخواہ کی رقموں کے لئے یہ مستقل ڈھونگ نہیں رچا رکھا۔ کیا تیری زندگی واقعی نسل کو بنانے، سنوارنے میں بیتی ہے۔ یا فکر روزگار میں؟ کیا تیری تربیت سے تیار کئے ہوئے سپوت یہی ہیں جو نوکر ہوتے ہیں تو بے ایمان اور آقا ہوتے ہیں تو ظالم۔ اگر قانون کے محافظ ہوتے ہیں تو قانون توڑنے کا فخر سب سے پہلے خود حاصل کرتے ہیں اور قانون بنانے والے ہوتے ہیں تو اپنی نا اہلی ماننے کے بجائے اور نظام بنانے کی ڈھٹائی سے کوشش کرتے ہیں۔ یہ بے انصاف جج۔ یہ رشوت خور حاکم یہ بے خوف اہلکار، یہ امیروں کے خوشامدی پڑھے لکھے اور یہ غریبوں کی ہمدردی کی دلالی کرنے والے لیڈر۔ کیا یہی ہیں میرے "قابل فخر شاگرد"؟"

اس کی ان باتوں کو سنتے سنتے میرا دماغی سکون ختم ہو جاتا ہے میرے حلق میں دھوئیں کا پھندا پڑ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرا نظام تعلیم خود میرا ہی گلا گھونٹ رہا ہے۔ میں بڑے زور سے کھانستا ہوں اور آواز بیٹھک میں گونج جاتی ہے۔ مجھے اس آواز میں کچھ اور کھانسیوں کی آوازیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ پھر جوں جوں کھانسی بڑھتی ہے ان آوازوں کی صدائے بازگشت بڑھتی جاتی ہے۔ دسوں پچاسوں سیکڑوں، ہزاروں ان گنت ۔۔ میری آواز میں نصف صدی بھر کے معلموں کی کھانسیاں گونجتی ہیں جن کی تعلیم نے پہلے انگریز کے غلام ڈھالے۔ پھر وطن کے بے شعور غلام اور اب آزاد غلام ڈھال رہی ہے ان استادوں کے شور کے پیچھے مجھے تعلیم بھی کراہتی سنائی دیتی ہے اسکی کراہیں کبھی چیخوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ چلاتی ہے یہ میرا قصور نہیں۔ میرا گلا نہ گھونٹو۔ میرے بس میں انسان بنانا کہاں میں خود انسان کی بنائی ہوئی ہوں۔ مجھے مت مارو مجھے بدل دو۔

آہستہ آہستہ یہ چیخیں ہلکی پڑ جاتی ہیں اور مجھے سکون ہوتا ہے اُس وقت سال صرف اسی وقت مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے انسان کی بے بسی کا علم ہوتا ہے۔ اور میرے دل کی سب سے بڑی آرزو (جو صرف اسی وقت ظاہر ہوتی ہے) پوری شدت سے ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ میرا ہاتھ حقے کی نے کو مضبوطی سے بھینچ لیتا ہے جیسے میں دامن امید تھامے ہوئے ہوں۔ اور پھر اس آرزو کو مجسم دیکھنے کے لئے میری آنکھیں شدت جوش سے پتھرانے لگتی ہیں۔ میرے کان کی لوئیں اشتیاق کی تیزی سے گرم لوہے کی سی سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ کاش میں نے یہ انسان نما حیوان نہ بنائے ہوتے۔ کاش میرے ہاتھوں نے یہ بس بھرے بیج بو کر دنیا میں اور زہر پھیلانے میں اپنے سے پہلے استادوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔ اب مجھے معلوم تھا کہ میں اس طرح اچھے لوگ نہیں ڈھال سکتا۔ پھر بھی میں نے روٹی کے لئے ۔۔ محض جبر اناج کے لیے۔ اپنی سوچ کو پاؤں تلے روند کر سیکڑوں معصوموں کو بگاڑ ڈالا۔ کاش میں مزدوری کر لیتا۔ کاش میں بھیک مانگ لیتا!! تو آج میرے ہاتھ ننھے خونوں سے رنگے ہوئے نہ ہوتے۔" اچانک میں حقے کی نے کو چھوڑ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہوں اور میرا دل پکار رہا ہے "دھو دو۔ کوئی میرے ہاتھوں سے اس خون کو دھو دو۔ کوئی میری پیشانی سے یہ کلنک مٹا دو۔ کوئی اور تعلیم لاؤ میرے مرنے سے پہلے کوئی ایسا نظام لا دو۔ جہاں انسان بنتے ہوں۔ جہاں ہر استاد کو صبح اٹھ کر بجائے نرخ کا حساب لینے کے خدا کو یاد کرنے کا وقت مل سکے۔ جہاں انگلے میں دھوئیں کی پھانسیاں اس کا گلا نہ گھونٹ سکیں۔ لا دو! خدا کے لئے ایسا نظام لا دو!"

میرا [illegible] یہ [illegible] پیشانی سے پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے پڑ [illegible] ٹھنڈی سانس نکل جاتی ہے۔ [illegible] مجھے اس وقت یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آرزو ان ساری آرزوؤں سے بہتر ہے جن کے پورا ہونے کی حسرت ہے۔ اور یہی ایک آرزو اس قابل ہے کہ اس پہ دم نکلے۔

علمی تحقیقی اور ادبی کتابیں

کتاب		مصنف	قیمت مجلد	قیمت
بیان اللسان	عربی اردو ڈکشنری	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	قیمت مجلد	دس روپے
تدبر قرآن		مولانا امین احسن اصلاحی	"	ڈھائی روپے
خطبات		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	"	سوا دو روپے
پردہ		" "	"	تین روپے آٹھ آنے
حقیقت نفاق		مولانا صدر الدین اصلاحی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر		" "	"	دو روپے آٹھ آنے
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل		مولانا ابواللیث اصلاحی	"	تین روپے آٹھ آنے
کلام عربی (حصہ اول)		قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	"	ایک روپیہ
کلام عربی (حصہ دوئم)		" " " "	"	ایک روپیہ چار آنے
تجدید تصوف و سلوک		مولانا عبد الباری	"	پانچ روپے
حقوق الزوجین		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں		سید اصغر علی عابدی	"	تین روپے
اشتراکیت اور اسلام		مظہر الدین صدیقی	"	چار روپے آٹھ آنے
سود		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	"	دو روپے بارہ آنے
گلگونہ		محمد یٰسین تسکین قریشی	"	دو روپے آٹھ آنے
ابھرتی کرنیں	(افسانے)	مرتبہ نجم الاسلام	"	" " "
عالمی امن	(نظمیں)	ادارہ معیار	"	آٹھ آنے
شوہر کا روگ	(ناول)	" "	"	ایک روپیہ چار آنے
شگفتہ	(ناول)	"	"	تین روپے
کوثر و تسنیم	(مجموعہ کلام)	آلم مظفر نگری	"	چار روپے
صحیفۂ ندرت	(")	ندرت میرٹھی	"	چار روپے آٹھ آنے
لوح و قلم	(")	" "	"	پانچ روپے
مکمل فائیل معیار ۱۹۵۲ء	(مجلد)		"	تین روپے ۱۲ر آنے
" " ۱۹۵۳ء	(مجلد)		"	تین روپے ۱۲ر آنے

ان کتابوں کے علاوہ دیگر علمی و ادبی کتابیں اور دینی کتب۔ قرآن شریف اور سیپارے وغیرہ بھی مل سکتے ہیں۔

مکتبہ "علم و ادب" شاہ پیر گیٹ میرٹھ (یوپی)

وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

ان دنوں ماہنامہ نقوش کے افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء میں بلونت سنگھ گارگی کا افسانہ "مشتابدی ملٹ" پڑھ رہا تھا۔ بلونت گارگی مشہور ترقی پسند افسانہ نگار ہے جس کی انگریزی نظموں کے مداح ٹیگور تھے۔ میں اُسکے یہ حالات پڑھکر بے حد مرعوب ہوا۔ اور افسانہ کو بڑی مرعوبیت کے ساتھ رات کے گیارہ بجے تک پڑھتا رہا۔
"گاڑی اگت پوری کے اسٹیشن پر رکی اور کافی دیر تک رکی رہی۔ یہاں انجن بدلنے والا تھا اور بجلی کا انجن اس کی جگہ لینے والا تھا"

میں چونکا ——— وہ تو شاید اگت گری ہے۔ لیکن گارگی پایہ کا ادیب ہے۔ اُس کی معلومات بے پناہ ہوں گی۔ پھر آگے چل کر وہ اسی بجلی کے انجن کے بارے میں لکھتا ہے۔
"گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ انجن نے بھاپ چھوڑی اور رک گیا"
بجلی کا انجن اور بھاپ؟ ——— کوئی بتاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ ——

(ابن فرید)

مصنف :- منشی دھرو دیالنکار ------------ مترجم :- ا م خاں مجبہ گوی

چنتا

کردار :-

(۱) راجہ
(۲) رانی
(۳) سوامی جی
(۴) دربان

پہلا منظر

راجہ :- (بھرائی ہوئی آواز میں) رانی ..... رانی .....

اب ..... اب

رانی :- کیوں، کیوں مہاراج! آپ اتنے زیادہ اُداس کیوں ہیں ؟-

راجہ :- دیکھو رانی! مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے کسی قسم کی چنتا نہیں ہے (اٹک کر) لیکن پھر بھی یہ زندگی ....

رانی :- ہاں یہ زندگی ......

راجہ :- جیسے میں پہاڑ جیسا موٹا اور بھاری ہوں ویسے ہی یہ زندگی پہاڑ جیسی موٹی اور بھاری معلوم ہوتی ہے -

رانی :- مہاراج، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ؟

راجہ :- میں نے اس موٹاپے کو گھٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا لیکن میرا یہ موٹاپا گنا ہوں کے بوجھ کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے ۔ مجھے (اٹک کر) بڑی حیرانی ہوتی ہے -

رانی :- آپ کو کیسی حیرانی ہوتی ہے مہاراج !

راجہ :- یہی کہ ...... یہی کہ میرے چھوٹے پیر اتنا بڑا بوجھ کس طرح اُٹھاتے ہیں - پیٹ جتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اتنی ہی ــــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میری ٹانگیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں

رانی :- مہاراج! آپ آج اس طرح کیوں ــــ

راجہ :- اس لئے ..... ہاں اسی لئے میرے پیروں میں اتنا درد ہوتا ہے چاہے میں کتنی ہی مالش کراؤں ..... لیکن وہ درد جاتا نہیں ۔ اگر کبھی ایسا ...

رانی :- آپ ...... مہاراج ..... اس طرح کا ......

راجہ :- سنو رانی ..... اگر کبھی ایسا ہو گیا کہ میرے چھوٹے سے پیروں نے اس بھاری بوجھ کو اُٹھانے سے انکار کر دیا تو پھر جانتی ہو کیا ہوگا (بھرائی ہوئی آواز میں) کیا ہوگا رانی ؟..... .....

رانی :- کیا ہوگا مہاراج! ایسا کبھی نہیں ہوگا مہاراج -

راجہ :- رانی، ہوگا یہ کہ مجھے دن رات ایک ہی جگہ چت ہو کر پیٹھ کے بل صرف ...... ہاں ... صرف لیٹے رہنا پڑے گا - نہ ادھر کروٹ بدل سکوں گا نہ اُدھر - پھر بچاری پیٹھ بھی اس بوجھ کو کب تک اُٹھا سکے گی -

رانی :- اس طرح گھبرانے سے تو کام نہیں چلے گا ۔ مہاراج

راجہ :- اس موٹاپے میں گھبرانے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے - مہارانی - جب میں دیکھتا ہوں

رانی :- کیا دیکھتے ہیں مہاراج ؟

راجہ :- لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کوئی اس تیلی کمر پر یوں ہی لٹو ہوئے تھے ؟ واقعی میری نظر

اگر کہیں جاکر ٹکتی ہے تو اس پتلی کمر پر۔ گھنٹوں
اس پتلی کمر کو غور سے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ پتلی
کمر ۔۔۔ جانتی ہو۔ شاعر کہاں غلطی کر گئے۔

رانی:۔ مہاراج! میں ان باتوں کو کیا جانوں! ہاں تو بتایئے
شاعر کہاں غلطی کر گئے؟۔

راجہ:۔ شاعروں نے کمر کو اتنا پتلا کر دیا کہ اُسے بالکل غائب
کر دیا۔ لیکن کمر کتنی خوبصورت ہوتی ہے کمر کی قدر
ایک شاعر ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ راج کوی بھی نہیں
جان سکتا۔ اُسے تو ایک موٹا توندوالا آدمی
ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے (میں کہتا ہوں)
شاعروں نے یہ ٹھیک طرح نہیں سمجھا کہ کمر بطن
کی وجہ سے غائب نہیں ہوتی ہے۔ آج کتنے
برس گزر گئے ۔۔۔ ہائے ۔۔۔۔ ہماری کمر
غائب ہو گئی۔

رانی:۔ مہاراج آپ اپنا علاج ماہر فن حکیموں سے کروا
رہے ہیں۔ یہ مرض کوئی ایسا تو ہے نہیں کہ لاعلاج
ہو۔ کچھ وقت ضرور چاہیئے۔

راجہ:۔ علاج ۔۔۔ رانی ۔۔۔ علاج۔ میں نے (اب تک)
کتنے علاج کئے ہیں اور کر رہا ہوں روز نسخے
بدلے جاتے ہیں اور میں نے دوا کے نام پر
کیا کچھ نہیں پیا اور کھایا ہے۔ آدمی کو دوا کے
نام سے کچھ بھی کھلایا اور پلایا جا سکتا ہے۔
شام سویرے گھوڑے پر سیر کو جاتا ہوں لیکن
کچھ نہیں ہوتا۔ ۔۔۔ کسی چیز سے کچھ نہیں ہوتا۔

رانی:۔ آپ اپنی پوری ریاست میں یہ اعلان کروا دیجئے
کہ جو کوئی مجھے اس موٹاپے کی بیماری سے اچھا
کر دے گا۔ اُسے میں آدھی ریاست اور ایک
کروڑ روپیہ دوں گا۔ اور اگر وہ اچھا نہ کر سکے
گا تو ۔۔۔۔

راجہ:۔ ہاں کہو! اگر اچھا نہیں کر سکے گا تو ۔۔۔۔

رانی:۔ تو اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس سے
یہ ہوگا کہ کوئی بھی ایسا حکیم آپ کے علاج
کے لئے نہیں آئے گا۔ جو روزانہ نسخے
بدلتا ہو۔ اس طرح آپ کی خدمت میں کوئی
ایسا بڑا حکیم ہی حاضر ہوگا جو آپ کو
اس تکلیف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا
دلا دے گا۔

راجہ:۔ رانی ۔۔۔ رانی ۔۔۔ مجھے تمہاری بات
بہت پسند آئی ہے۔ مجھے پکا یقین تو نہیں
ہے۔ لیکن کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں ہے۔ کل
ہی رانی ایسا اعلان ساری ریاست میں
کروا دیا جائے گا۔ آدھی سلطنت تو کیا
اگر ساری سلطنت بھی چلی جائے اور مجھے
اپنی ہلکی پھلکی زندگی مل جائے تو بھی وہ مہنگی
نہیں ہے۔

دوسرا منظر

دربان:۔ مہاراج آپ کا علاج کرنے کیلئے ایک سادھو جی
آئے ہیں۔ بڑی دور کی پہاڑیوں سے آئے ہیں

راجہ:۔ کیا اُن کے پاس کچھ جڑی بوٹیاں ہیں یا اُن کے
پاس کوئی دوائیوں کا بکس ہے۔

دربان:۔ اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بالکل
خالی ہاتھ ہیں۔

راجہ:۔ وہ کہتے کیا ہیں؟۔

دربان:۔ وہ کہتے ہیں کہ مہاراج کو ایک ہی مہینے میں
اچھا کر دیں گے۔

راجہ:۔ (حیرانی کی ہنسی کی ہلکی سی آواز) ایک مہینے میں؟

دربان:۔ جی حضور! وہ تو یہی کہتے ہیں۔

راجہ:۔ میں برسوں علاج کرکے ہار گیا۔ کہیں وہ پاگل
تو نہیں ہیں۔؟ یا اُن کو اپنی جان پیاری نہیں ہے؟

دربان:۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا مگر وہ تو اپنی بات پر بالکل اٹل ہیں۔

راجہ:۔ تو اچھی بات ہے۔ انہیں ہمارے پاس حاضر کرو۔

(دربان جاتا ہے سوامی جی آتے ہیں۔ ان کے آنے کی آواز)

سوامی:۔ مہاراج کی جے ہو۔ مہاراج کا کلیان ہو۔

راجہ:۔ آئیے سوامی جی۔ پدھاریئے۔

سوامی:۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مہاراج۔

راجہ:۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میرا علاج کر سکیں گے؟۔

سوامی:۔ پربھو کی کرپا سے اس سنسار میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ کوئی شے تب ہی ناممکن ہو جاتی ہے جب ہم اُسے ناممکن سمجھ لیتے ہیں۔

راجہ:۔ تو آپ میرا علاج کر سکتے ہیں۔

سوامی:۔ آپ اچھے ہو سکتے ہیں اور اچھے ہو جائیں گے۔ وہ بھی ایک مہینہ میں اور صرف ایک مہینہ میں۔

راجہ:۔ میں .... میں .... ایک ہی مہینہ میں اچھا ہو جاؤں گا؟! میں تو برسوں سے علاج کروا رہا ہوں پھر بھی اچھا نہ ہوا۔ اور آپ کہتے ہیں۔ ....

سوامی:۔ میں صرف کہتا ہی نہیں ہوں کر کے دکھاتا ہوں۔

راجہ:۔ آپ تو اپنے ساتھ شاید ایک بھی دوا نہیں لائے ہیں نہ تو آپ کے پاس دوا کا کوئی بکس ہے اور نہ جڑی بوٹیاں؟۔

سوامی:۔ علاج صرف بنی ہوئی یا گھٹی ہوئی دواؤں سے یا جڑی بوٹیوں سے ہی نہیں ہوتا۔ اصل علاج ہوتا ہے من سے اور خیالوں سے۔

راجہ:۔ سوامی جی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سوامی:۔ حضور یہ بات تب تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ اس کا احساس نہیں ہو جاتا۔ من کی اور وچار کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہمیں ایک تو اس کا پتہ نہیں ہے اور دوسرے ہم اسکو استعمال بھی کرنا نہیں جانتے۔

راجہ:۔ سوامی جی آپ میرا علاج کر سکتے ہیں۔ آپ میری شرطوں

سے واقف ہی ہیں نا!

سوامی:۔ مہاراج۔ میں آپ کی شرطوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور وہ مجھے منظور ہیں۔ مہاراج میری بھی ایک شرط ہے اور میں ایک شرط پر علاج کرتا ہوں۔

راجہ:۔ وہ کیا شرط ہے۔ سوامی جی!

سوامی:۔ میری شرط یہ ہے کہ میں علاج کرنے سے پہلے جنم پتری یا جنم کنڈلی کو دیکھ لیتا ہوں۔ اگر مجھے جنم پتری سے یہ معلوم ہو کہ جس کا میں علاج کرنا چاہتا ہوں وہ جلد ہی یا عنقریب ہی مرنے والا ہے تو میں اس کا علاج نہیں کرتا۔

راجہ:۔ تو مجھے اپنے علاج سے پہلے اپنی جنم پتری آپ کو دکھانی ہوگی۔ اگر اس میں یہ معلوم ہو کہ میں .... جلد ہی یا عنقریب ......

سوامی:۔ تو مجھے دکھ ہے کہ میں آپ کا علاج نہیں کر سکوں گا مہاراج! کیونکہ آپ بتلائیے اُس حالت میں علاج کرنے سے فائدہ ہی کیا۔؟۔

راجہ:۔ ٹھیک ہے۔ میں اپنی جنم پتری ابھی منگوا لیتا ہوں

سوامی:۔ اچھی بات ہے۔

راجہ:۔ لیجئے یہ میری جنم پتری ہے اسکو دیکھ لیجئے۔

سوامی:۔ (کاغذ کو ہاتھ میں لینے اور اُلٹ پلٹ کرنے کی آواز) میں نے آپ کی جنم پتری کو دیکھ لیا ہے۔ اس میں سب گرہ ٹھیک ہیں لیکن ایک گرہ ایسی جگہ ہے کہ جس سے ......

راجہ:۔ ہاں اُس سے کیا معلوم ہوتا ہے؟۔

سوامی:۔ مہاراج معاف فرمائیے میں آپ کا علاج نہیں کر سکوں گا۔

راجہ:۔ (گھبرا کر) کیوں کیوں، سوامی جی بات کیا ہے؟۔ آپ میرا علاج کیوں نہ کر سکیں گے؟

سوامی:۔ مجھے افسوس ہے ...... نہایت ہی افسوس ہے کہ آپ کی موت آج سے ایک مہینے کے بعد ہو جائے گی

اس لئے اب آپ ہی بتلائیے مہاراج! آپ کا
علاج کرنے سے کیا فائدہ ؟

راجہ:۔ سچ! سچ! مگر...... اگر آپ کی بات صحیح نہ نکلی تو؟

سوامی:۔ مہاراج آپ مجھے ایک مہینہ تک جیل میں رکھئے۔
اگر میری بات جھوٹ نکلے تو آپ مجھے جو چاہیں سزا
دے سکتے ہیں۔

راجہ:۔ تو کیا آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ سچ! سچ!
کیا میری موت ایک مہینہ میں ہونے والی ہے
پھر علاج...... سب...... علاج...... یہ
سب...... علاج۔ اچھا آپ کو جیل میں رکھا
جائے گا اور اگر آپ کی بات صحیح نہ نکلے تو پھر ایک
مہینے کے بعد...... آپ کو زندگی سے ہاتھ
دھونا پڑے گا۔

سوامی:۔ مجھے منظور ہے۔

ستار کی آواز

(تیسرا منظر)

رانی:۔ مہاراج بڑا غضب ہے۔ آپ نے تو سوامی جی کے
کہے کو بالکل سچ سمجھ لیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ
دے جو کچھ......

راجہ:۔ اگر وہ سچ نہیں کہتے تو کیوں اس طرح جیل میں
اپنی خواہش سے ہی قید ہو جاتے۔ پھر موت کوئی
ایسی چیز تو نہیں ہے۔ جو نہیں ہوگی......

رانی:۔ مہاراج...... مہاراج...... آپ تو سوامی
جی کے کہنے کو خود ہی سچ بنا دینے کی کوشش کر رہے
ہیں۔ آپ کو تو......

راجہ:۔ رانی انہوں نے کتنے غور سے، کتنی دفعہ میری جنم
پتری کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن جب زندگی
ہی نہ رہے گی تو پھر علاج سے کیا فائدہ۔...

رانی:۔ مہاراج...... آپ اس سوامی کی باتوں میں

نہ آئیے۔ آج کل بہت سے لوگ گیروے کپڑے
پہن کر فقیر بن جاتے ہیں۔

راجہ:۔ جس دن سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ میری زندگی
اب بہت ہی تھوڑے دنوں کی ہے...... مجھے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک منٹ......
...... ایک ایک لمحہ جیسے موت کا ایلچی ہے
...... اور جیسے وہ میری زندگی چھین لینے کے
لئے آرہا ہے......

رانی:۔ (روتی آواز میں) میں سچ کہتی ہوں مہاراج۔ اس
سوامی نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔

راجہ:۔ رانی...... رانی...... یہ زندگی صرف اسلئے
چل رہی ہے۔ کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ کس
منٹ یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔

رانی:۔ مہاراج حوصلہ رکھئے۔ ہمت پیدا کیجئے۔ اٹھئے تو۔

راجہ:۔ رانی...... میرا ایک ایک دن، ایک ایک پل
...... کیسے گزر رہا ہے جیسے میں اپنے دل کی
دھڑکنوں کو گن رہا ہوں۔ ایک منٹ کے بعد جو
دوسرا منٹ آتا ہے وہ اس سے زیادہ خوفناک
اور خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

رانی:۔ اس طرح ڈرنے سے تو آپ پاگل ہو جائیں گے
مہاراج۔

راجہ:۔ میں پاگل...... پاگل...... بے ہوش...... بتاؤ
...... بتاؤ...... رانی میں ہوش میں رہ کر کیا کروں
گا۔ ہوش میں ہی مجھے تو موت کے سوا کچھ دکھائی ہی
نہیں دیتا ہے۔

رانی:۔ (روتی ہوئی) میں آپ کو کیسے سمجھا سکتی ہوں...
...... آپ کو نہ کھانے کی سدھ ہے نہ پینے کی بدھ
نہ زندگی کے کسی اور کام کی۔ آپ تو دیمک کی
لکڑی کی طرح ایک موت کی...... ہائے اس لکڑی
موت کی ہیں...... ہائے...... لوگ کیا کہتے ہیں

راجہ:۔ پھر بھی وہ آتی نہیں رانی۔ موت کا انتظار موت

سے زیادہ بھیانک ہے۔

رانی:۔ مہاراج ڈر نہیں اس لئے ڈرا رہا ہے کیونکہ ہم ڈرتے ہیں۔ اگر ہم ڈریں نہیں تو ڈر ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔

راجہ:۔ ڈر۔ ڈر، ڈر...... ڈر اگر آ جائے تو شائد اس میں اتنا ڈر نہ معلوم ہو۔ لیکن اس کا انتظار......

موت کا انتظار......

رانی:۔ دیکھئے مہاراج ...... اس ڈر کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ آپ دن بدن سوکھ کر کانٹا ہوتے جا رہے ہیں آپ کا جسم کیا سے کیا ہو گیا ہے (رو کر) آپ تو خود ہی موت کو بلا رہے ہیں۔ ایسا نہ کیجئے مہاراج ...... اس سوامی کی بات بالکل جھوٹی ہے۔

راجہ:۔ یہ زندگی کیا ہے؟ کس لئے ہے! جب مرنا ہی ہے تو پھر زندگی کیوں؟ زندگی ہماری زندگی تب ہی رہ سکتی ہے۔ جب ہمیں موت کا خیال تک نہ ہو اگر زندگی کے سر پر موت ہمیشہ سوار رہے تو ایسی زندگی موت سے بدتر ہے۔

رانی:۔ آپ موت کے خیال کو دماغ سے نکال دیجئے مہاراج

راجہ:۔ موت کے خیال کو دماغ سے نکال دینے سے ہی کیا موت نہیں آئے گی۔ موت .... موت ...... جب ہر گھڑی موت سر پر منڈلا رہی ہو ...... تو پھر زندگی ہاں یہ زندگی کیسے بیت سکتی ہے۔

ستار کی آواز

(چوتھا منظر)

رانی:۔ مہاراج اٹھئے۔ دیکھئے نہ آخر سارا مہینہ گزر گیا اور آپ زندہ ہیں۔ میں کہتی نہ تھی کہ آپ ...... جھوٹا ہے وہ سوامی۔

راجہ:۔ رانی۔ ...... میں زندہ ہوں سچ مچ زندہ ہوں رانی۔ موت کی ندی کو پار کر گیا ہوں۔ مہینہ بیت گیا

اس مہینہ کا ایک ایک منٹ کیسا بیتا ہے

رانی:۔ مہاراج اس سوامی کو بلایا جائے اور اسے وہ سزا دی جائے جس کا کہ وہ سزاوار ہے۔ کیسی باتیں بنا تا تھا وہ ......

راجہ:۔ تو ہاں رانی، اُسے بلایا جائے (دربان کے جانے کی اور سوامی جی کے آنے کی آواز)

راجہ:۔ سوامی جی پدھاریئے۔ دیکھتے ہیں آپ۔ کیا کہا تھا آپ نے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ میرا علاج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایک مہینہ میں ...... کیا آپ نے جنم پتری ٹھیک طرح نہیں دیکھی تھی؟

سوامی:۔ (دھیمی آواز میں) جنم پتری دیکھی تھی اور اچھی طرح دیکھی تھی لیکن کیا کوئی اچھی سے اچھی آنکھ والا ہمیشہ اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔

راجہ:۔ جب آپ اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے تو آپ نے کیوں اس طرح کی بات کہی تھی۔ اب تو آپ کو اپنی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔

سوامی:۔ میں اپنی سزا بھگتنے کے لئے بالکل تیار ہوں لیکن ......

راجہ:۔ لیکن ...... لیکن ...... کیا؟

سوامی:۔ مہاراج سزا لینے سے پہلے میری ایک خواہش ہے

راجہ:۔ کیا خواہش ہے؟

سوامی:۔ اگر آپ کا حکم ہو تو کہوں!

راجہ:۔ ہاں کہئے ضرور کہئے۔

سوامی:۔ مہاراج آپ اس بڑے آئینے کے سامنے ایک منٹ کے لئے کھڑے ہو جائیں تو جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ میں آپ کے حضور میں کہہ سکوں گا۔

راجہ:۔ اچھی بات ہے

(راجہ کے چل کر کھڑے ہونے کی آواز)

سوامی:۔ دیکھتے ہیں آپ اپنے سارے جسم کو اس بڑے آئینہ میں مہاراج ....

راجہ:۔ ہاں دیکھ رہا ہوں تو پھر ......

سوامی :- کیا آپ کا یہ جسم وہی جسم ہے جو پہلے تھا۔ آپ تو بالکل دبلے پتلے کانٹے جیسے بدن کے ہو گئے ہیں پہلے تو آپ کا جسم بہت موٹا تھا !؟

راجہ :- تو پھر ــــــ

سوامی :- آپ کے موٹاپے کی تو موت ہو گئی اور اس میں سے آپ کا اصلی دبلا پتلا جسم نئے روپ میں بدل سا گیا ہے۔ آپ کی موت واقع ہو کر جیسے آپ کا نیا جنم ہو گیا ہے۔ اور آپ چاہتے ہی کیا تھے مہاراج؟

راجہ :- سوامی جی میں اس مرنے کی چنتا میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں دبلا پتلا اور چھریرے بدن کا ہونا چاہتا تھا (آئینہ میں بار بار اپنے کو دیکھ کر) سچ مچ میں کتنا دبلا ہو گیا ہوں اور وہ بھی بنا کسی دوائی کے۔ خوب سوامی جی۔ خوب۔ تو یہ آپ کی مجھے اپنی بیماری سے اچھا کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ یہ میرا علاج تھا۔

سوامی :- مہاراج .... مجھے یہ کہنے دیجئے کہ جب انسان بڑا بن جاتا ہے تو جہاں اس کا من پھولنے لگ جاتا ہے وہیں تن بھی پھولنے لگ جاتا ہے۔ اگر بڑے آدمیوں کے دل میں اس موت کی فکر کا ڈر ہمیشہ بیٹھا رہے تو پھر نہ ان کا من پھول سکتا ہے اور نہ تن۔

راجہ :- سچ مچ اس ایک مہینے میں میری سچ مچ موت ہو گئی ہے میں اب ایک بالکل نئے روپ میں پیدا ہو گیا ہوں۔ سوامی جی ــــــ سوامی جی میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ آپ کو آدھی سلطنت اور آپ جو چاہیں ملے گا۔

سوامی :- مجھے آپ کی صحت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیئے۔ مہاراج ! مجھے گوالنے ہی پر رہنا ہے کہ آپ سدا اسکھی رہیں۔

معیار کی توسیع اشاعت اور استحکام کی خاطر

۱:- ذی استعداد علم دوست اصحاب اور احباب کے پتے ارسال فرمائیے۔

۲:- اپنے یہاں کی لائبریری۔ نیوز پیپر ایجنٹ کے پتے ارسال فرما دیجئے۔ اور انہیں معیار کی طرف توجہ دلائیے۔

۳:- گذشتہ تین سال کے بالحاظ ترتیب چھ ماہ کے مختلف پرچے چار آنے فی پرچے کے حساب سے ارسال کئے جا سکتے ہیں۔

۴:- انفرادی خریداران جنکی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے آئندہ ایک سال کا چندہ جلد از جلد ارسال فرمادیں۔

ایجنٹ صاحبان اپنا گذشتہ حساب جلد صاف فرمادیں۔

آپ اپنی نظر میں کوئی تعاون چاہے سادہ ہی کیوں نہ سمجھیں لیکن ہمارے لئے یہ بہت گرانقدر اور باعث سپاسگذاری ہوگا۔ باہمی اشتراک معجز نما اثرات رکھتا ہے۔

منیجر معیار

ہیرالال

کس کی کہانی لکھوں ـــــ؟؟

بہت دنوں سے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ آج دل بے چین تھا کچھ لکھنے کے لئے۔ بار بار دماغ میں کچھ خیالات اُبھرتے آ رہے تھے۔ مگر کوئی کہانی کا تسلسل صحیح طور پر دماغ میں نہیں آ رہا تھا۔ مختلف کہانیاں تو آ رہی تھیں۔ مختلف کہانیاں مختلف قسم کی تھیں۔ یوں تو ہر انسان اپنے ساتھ ایک کہانی لئے پھرتا ہے۔ کسی انسان کی زندگی کی گہرائی میں چلے جائیں تو کئی بہت سی کہانیاں مل جاتی ہیں۔ میں آج کوئی انوکھی کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ مگر ذہن کسی طرح بھی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ گرم ہوائیں چل رہی تھیں بدقسمتی سے میرا گھر سڑک کے کنارے واقع ہے گھر کے سامنے ہمیشہ موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ میری کہانی کے ابھرتے ہوئے ان خیالات کو موٹروں کی آوازیں درہم برہم کر رہی تھیں۔ ایک پلاٹ جاکر دوسرا پلاٹ ابھرتا نظر آ رہا تھا جس طرح ایک موٹر کے بعد دوسری موٹر آتی ہے۔ یہ موٹریں خاموشی سے بھی نہیں جاتیں اپنے پیچھے دھول اُڑاتی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں۔ کانوں میں، کاغذ پر یہ دھول پھیل جاتی ہے۔ پھر تھوڑے سے وقفہ ہی سے کوئی آ دھمکتا ہے۔ ایک بدقسمت جرنلسٹ ہونے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی کام لیکر آ ہی جاتا ہے۔ "ہمارے گاؤں میں ایک عورت باؤلی میں گر گئی صاحب اُس کے چند وجوہات ہیں" "ہماری زمین پر فلاں زمیندار نے غنڈوں کی مدد سے قبضہ کر لیا ہے" "بلدیہ والے مجھے ناجائز طور پر ستاتے ہیں" "فلاں انسپکٹر سڑک کے کنارے دوکان لگانے کے لئے دس روپیہ نذرانہ مانگتا ہے" کوئی صاحب دھمکتے ہیں کہ آپ نے ہمارے جلسے کی کوئی خبر ہی نہیں بھیجی۔ سب جلسے میں تقریر کرتے ہی عوام نے ان کو نیتا ہی مان لیا۔ پبلسٹی کے بھوکے سیاسی قائدین سے سر چکرا جاتا ہے۔ پتہ نہیں خبروں کو لوگ اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ جیسے خبر بھیجنے سے ان کی دوکان لگ جائے گی اس پر اس کا قبضہ مل جائے گا۔ اس طرح سے مجھے ان آہوں اور چیخوں کو سننے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مذاق تو نہیں کر رہا ہوں۔ کیا وہ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں۔ مجھ سا ایک جرنلسٹ ایک ورکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماج اور ماحول میں وہ طوفان انگیز تبدیلی نہ سہی۔ مگر ان کو متاثر ضرور کر سکتا ہے۔ اگر جرنلسٹ حقیقتوں کو لکھنا شروع کر دیں تو ان پارٹیوں کے لیڈروں کو غصہ آ جاتا ہے۔ واہ آپ نے فلاں جلسے میں صرف نو آدمیوں کی تعداد بتلائی مگر دس ہزار آدمیوں کی تعداد بتلاتے تو آپ کا کیا جاتا تھا ــــ مگر ہم کمیونسٹوں کی دن رات کی مصروفیتوں کو لکھیں تو کمیونسٹ چلانے لگتے ہیں کہ جھوٹی نیوز دیتا ہے اور ہم کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حکومت کا چمچہ ہے۔ حقیقی واقعات کو چھپاتا ہے۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم ہماری پبلسٹی ہی کرو مگر ہم پر تنقید نہ کرو۔ تاکہ ہمارے کالے کرتوت دوسروں کو معلوم نہ ہوں۔ تم لکھو گے تو ہم تمہارے خلاف آواز اٹھائیں گے تم کو بدنام کر ڈالیں گے یہاں تک ہمارے ضلع کے کمیونسٹ قائدین نے جرنلسٹوں کو خوف زدہ بھی کیا۔ دوسری طرف حکومت کی جماعت کانگریس کے خلاف لکھیں تو کانگریس والے حکومتی رعب بتلاتے ہیں۔ پولیس کا ڈر دکھلاتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں مجھے کچھ حقیقت لکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ خواہ وہ کمیونسٹ ہو کہ کانگریسی۔ یا فرقہ پرست ہی کیوں نہ ہو۔ جو بات حقیقت ہو گی اس بارے میں لکھنا میرا فرض ہو جاتا ہے خواہ وہ ڈی ایس پی کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ کلکٹر کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ یہ میری فطرت کی آواز ہے۔ اس کو میں دبا نہیں سکتا۔ زمانہ اب ایسا آ گیا ہے کہ ہر قائد ہر سیاسی جماعت جرنلسٹوں کو اپنے پاکٹ کی سگرٹ کی ڈبی سمجھنے لگی ہے۔ جب جی چاہا ایک سگرٹ سلگا لیا۔ شائد انہیں معلوم نہیں کہ کچھ جرنلسٹ بھی ایسے ہیں جو سگرٹ کی ڈبی بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اپنے فطرت کی آواز کو دبا نہیں سکتے۔ مجھے ان بے وقوفوں پر ہنسی سی آتی ہے۔ کچھ

تھوڑی سی سیاسی تبدیلی کو دیکھکر یہ قائدین عجیب و غریب ہوائی قلعے بنانے لگے ہیں۔ چند ترقی پسند سیاست داں مرحوم سیاست دانوں کے پیچھے پیچھے ہوتے ہوئے اپنے کو ان کے برابر کا قومی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اپنے کو ان کا جانشین ہی سمجھنے لگتے ہیں جیسے کہ سیاست کسی کی باپ کی ملکیت ہے۔ مگر تعجب اس بات کا ہے کہ ہمارے پاس چند ایسے قائدین کی تعداد ہے۔ جو اپنے آپ کو جگت نیتا سمجھتے ہیں۔ شائد وہ نہیں جانتے کہ ان کے اعزاز عارضی ہیں۔ کرایہ کے اعزاز میں کچھ حد تو ہے۔ مگر سیاسی اعزاز زمانے کے ایک ہی جھونکے کا محتاج ہوتا ہے۔ ایک ذرا تھپیڑے میں لاپتہ ہو جاتا ہے۔ میں بہت سے ایم ایل اے اور ایم پی کو جانتا ہوں جو اپنے حلقے میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ اپنے عوام سے بات کہتے ہوئے انہیں پسینہ سا آجاتا ہے۔ اسلئے بہت سے ایم ایل اے شہروں میں بسنے لگے ہیں۔ کوئی ایم ایل اے شہر میں رہکر ایل۔ ایل بی کر رہا ہے۔ کوئی ایم ایل اے گھوڑوں کی ریس میں ہر روز حصہ لے رہا ہے۔ کوئی ایم ایل اے پیروی کرکے اپنے مستقبل کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ کوئی ایم ایل اے ڈپٹی منسٹر بننے کی فکر میں یا کوئی اعزاز حاصل کرنے کی لگن میں بڑے بڑے حضور والا کے دربار میں جھاڑو دے رہا ہے۔ ایسے بہت سے نرم و نازک واقعات ہیں جنکو دیکھتے ہوئے بھی ہمیں روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اتفاقاً مجھے ایک سیاسی جلسے میں جانا پڑا۔ ایک شخص اسٹیج پر آکر ہاتھ پھیلا پھیلا کر من مانی بول رہا تھا صحیح لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ جلسے کا اعلان کس مقصد کے لئے تھا اور یہ صاحب اس مقصد کو چھوڑکر ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ مگر وہ تقریر کئے جا رہے تھے اس ساری مشقت کے باوجود بھی کسی نے کچھ بھی نہ سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک سے پوچھا یہ کون ہیں ایک والنٹیر نے کہا کہ یہ ہمارے ضلع کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ کل تک انڈر گراؤنڈ... سمجھے یعنی کل تک۔ یہ حضرت بندوق کاندھے پر رکھکر جنگلوں اور جھاڑوں میں چھپتے پھرتے رہے ہیں۔ اپنے آپ کو انقلابی کہتے رہے ہیں اگر ان کی بہادری کے قصے معلوم کرنا چاہیں تو پھر ان تہہ خانوں اور جھاڑوں سے پوچھنا پڑے گا۔ تاکہ ان کی ننگی داستانیں کھلکر سامنے آجائے۔ ان کے ہاتھوں سے قتل کی ہوئی معصوم جانیں تو کچھ بتلا نہ سکیں گی اور اگر کوئی بتلائیگا تو یہ لوگ اس کو زندہ نہ چھوڑیں گے میں یہ سوچ ہی رہا تھا اور وہ حضرت تقریر کئے جا رہے تھے یہ سیاسی قائدین چاہتے ہیں کہ ان کی ان بے سمجھ اور فضول باتوں کو ہم اپنی طرح سمجھیں۔ بنا کر اخباروں میں بھیجیں اور ان کے جلسوں کی تعریف کریں

میں آج دراصل ایک رومان بھری کہانی لکھنا چاہتا تھا مگر کچھ ایسی حقیقی کہانیاں میرے اطراف روز بروز ابھر رہی تھیں کہ رومان کی کہانی لکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ یہی حقیقی کہانیاں قلم کے سہارے کاغذ پر پھیلتی ہی جا رہی تھیں اتنے میں ایک درزی آیا۔ لیجئے صاحب آپکی قمیص! "ابھی کیا چاہتے ہو"۔ اسکی اجرت کچھ بھی دیجئے صاحب آپ کی مہربانی ہے۔ ارے اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ تم نے محنت کی اور تمکو پوری اجرت مانگنے کا حق ہے" صاحب آپ سے کیا اجرت کا تقاضا کروں۔ کون یہاں صحیح اجرت دیتا ہے۔ ایک اعلیٰ آفیسر ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتا ہے۔ قمیص کے لئے روپیہ دیتے وقت تکرار کرتا ہے۔ ہم درزی لوگ ہی بدنصیب ہیں صاحب۔ صبح شام ہم اپنی جوانی ان قمیصوں پتلونوں، جاکٹوں اور بلوزوں میں بھر بھر کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے پیٹ تک نہیں بھرتے۔ ہمارے سلے ہوئے پائجامے اور پتلون پہن پہن کر لوگ ہماری طرف ایک گندی نگاہ ڈالکر چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھکر بات کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ دن رات کی محنت کے بعد بھی ہم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ میرے لڑکے حامد کی قمیص پھٹ گئی ہے دو ماہ سے پھٹی قمیص پہنکر قمیصوں کی تیاری میں مدد کر رہا ہے۔ میرا دل جل جاتا ہے صاحب۔ یہ پھٹی قمیص پہنکر ہم کب تک نئی قمیص تیار کرتے رہیں گے۔ کیا یہ فرق کبھی مٹ جائے گا۔ یہ تو ہماری بات ہوئی۔ گھر میں میری بیوی سال بھر سے دمہ سے پریشان مگر دوا علاج کے لئے کبھی پیسے جمع نہیں ہوئے۔ اس طرح محنت کرتے کرتے آدھی زندگی کٹ گئی۔ اب ہماری زندگی کی قندیل میں تیل بھی ختم ہونے کو ہے۔ سلیمان کی باتیں سنکر مجھے بہت سے درزی دوست یاد آگئے جن کے گھروں میں موت واقع ہونے پر ان کو چندے مانگنے پڑے۔ اس سماج میں دن بھر محنت کرنے کے باوجود بھی انسان کو بھوکا مرنا پڑتا ہے اس کی لاش کے لئے اچھے قمیص پہننے والوں کے پاس جاکر بھیک مانگنا پڑتا ہے۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ادھر سیاسی قائدین چھوٹی موٹی تقریریں کرکے یہ بیوقوفوں کو نیتا بناتے ہیں اپنے جیکارے اور نعرے لگواتے ہیں۔ اپنے جلسوں کی رونق انہی نوجوانوں سے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج مجھے سب سے زیادہ بگڑے ہوئے یہ سیاسی قائدین ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جو اخبار کی چاپلوسی کرکے ان سے چندے

وصول کرتے ہیں اندر اندر ان کی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ ادھر غریبوں سے وعدے کر کے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ کاش یہ لیڈر پیدا ہی نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ دھن والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں دوڑتی۔ یہاں محنت ایک کرتا ہے پیٹ دوسرے کا بھرتا ہے۔ قتل ایک کرتا ہے سزا دوسرے کو ملتی ہے۔ ہمارے پاس قاتلوں کے سردار زبردست سیاسی قائدین کہلاتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو دیش بھگت اور انقلابی نیتا کہتے ہیں۔ اتنے میں میری بھابی نے مجھے پکارا کہ چلو کیا رکھ رہے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ۔" بھابی چلو ابھی آتا ہوں "۔ "نہیں نہیں ابھی آؤ" کہتے ہوئے چلی گئی۔ سنتے ہی بھابی کی فوج مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ چلو چچا جی چائے پینے کے لئے ماما جی بلا رہی ہیں اتنے میں ایک زبردست آواز میرے کانوں سے آکر ٹکرائی۔ اور میں چائے پینے کے لئے اندر چلا گیا اور خیالات کا تانتا ٹوٹ گیا اور یہ کہانی ادھوری ہو گئی؟ واقعی زندگی کی کہانی بھی جس طرح شروع ہوئی ہے اسی طرح ختم بھی ہو جائے گی اور یہی ہمارے جیون کا ایک بڑا بھید ہے۔"

خطوط و نکات

- لالہ صحرائی
- ابن احمد گورکھپوری
- حبیب الرحمن خاں
- محمود الحسن شاہد

داغ داغ اجالے پر تبصرے

لالہ صحرائی:-

ستمبر ۵۳ء کے نقشِ اول کی "شہ" پاکر سب سے پہلے ابن فرید صاحب کا افسانہ "داغ داغ اجالے" پڑھا۔ افسانہ کی پلاٹنگ صاحب افسانہ نے بہت خوب کی ہے۔ اور اس کے لئے وہ مستحق داد ہیں لیکن جیسا کہ آپ نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ موصوف اس پلاٹنگ کو پوری طرح (Demeanor) نہیں کر سکے، جس کی وجہ سے افسانے کے مرکزی تاثر کی نشو و نما میں جھول رہ گیا ہے۔ اور اس میں مضمر رمزیت (——— SYMBOLISM) کے اشارے کنائے بھی واضح اور نمایاں نہیں ہو سکے رمزیت (SYMBOLISM) کی ٹیکنک نہایت ہی زبردست فنی مہارت اور چابکدستی کی متقاضی ہے۔ اور یہی اعتبار سے اپنے بھرپور استعمال کی صورت میں قاری کو ایک عظیم تاثر کی دولت سے فیضیاب کرتی ہے ——— ایک ایسے ہی عظیم تاثر سے جو کسی مرصع شعر سے حاصل ہوتا ہے۔! اب ظاہر ہے کہ اگر اس کا استعمال صناعانہ اور فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ نہ ہوگا۔ تو مطلوبہ تاثر کی ساری شان و شوکت ماند پڑ جائے گی۔ اور افسانہ پھیکا سا ہو کر رہ جائے گا۔

البتہ یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ ایک افسانے کا عہد لازماً زندگی کا کوئی ایک ہی واقعہ ہونا چاہیئے نہ کہ پوری زندگی ——— افسانے کی فضا کو یوں محدود کر کے رکھ دینے کا نہ کوئی قاعدہ کلیہ اب تک بن سکا ہے۔ اور نہ ہی شاید بن سکے۔ خود فن افسانہ نویسی کے بیشتر نئے اور پرانے اساتذہ نے متعدد ایسے افسانے لکھے ہیں جن کا عہد (Period) ان کے کرداروں کی تقریباً ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس کے باوجود وہ افسانے نہایت ہی کامیاب تخلیقات ہیں۔ اور دنیا کے کلاسیکل افسانوی ادب میں شامل کئے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں علی الخصوص ٹالسٹائی اور منشی پریم چند کی تخلیقات قابل توجہ ہوں گی ———

مزید برآں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک ناول کو بھی لازماً اپنے کردار کی پوری زندگی پر محیط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ متقدمین یا متاخرین اساتذہ ادب کے ہاں کسی نے بھی اس خیال کو قاعدے کلیہ کا درجہ نہیں بخشا، اس کے برعکس متعدد ایسے معیاری ناول دنیا کے ادب میں موجود ہیں۔ جن کا عہد کسی فرد کی زندگی کے ایک خاص جزو یا کسی معاشرہ کی زندگی کے ایک خاص شعبہ یا کسی دور زمانہ کے ایک خاص حصے پر مشتمل ہے۔ مثلاً اس ضمن میں آئرلینڈ کے مشہور ادیب LIAM O' FLAHERTY کے مشہور ناول THE INFORMER کو ہی لیجئے، جس کا Period شاید چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں۔ لیکن اسکے باوجود فنی نکتہ نگاہ سے وہ بے حد کامیاب ناول ہے۔

دراصل فنی لحاظ سے ایک اچھے افسانے کے بنیادی لوازمات صرف دو ہی ہیں۔ وحدت تاثر اور شدت تاثر ——— اگر کوئی افسانہ ان دو بنیادی لوازمات سے مزین ہے اور بیان و اظہار کے دوسرے

فنی تقاضوں کی تکمیل سے بھی بہرہ ور ہے۔ تو اسے بہر حال ایک کامیاب افسانہ سمجھا جائے گا۔ قطع نظر اس امر کے کہ اس کا عہد انسانی زندگی کے ایک خاص حصہ پر مشتمل ہے۔ یا پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ یا اس سے بھی بڑھکر ساری نسل انسانی کی پوری تاریخ پر محیط ہے — رہ گیا ناول سو اسکے لئے بھی بنیادی طور پر وحدت تاثر کا عنصر لازمی ٹھہرتا ہے۔ یہاں اظہار تاثر کے لئے ضرور نسبتاً ایک وسیع کینوس استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی نسبت سے اس کے لئے شدت تاثر کی شرط لازمی نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ اسکی بجائے تاثر و احساس کی ایک آہستہ خرام اور سبک گام رو کی موجودگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور یہی افسانے اور ناول کا فنی نقطۂ نگاہ سے بنیادی فرق ہے۔ افسانہ ایک بھرپور آبشار ہے اور ناول ایک آہستہ رو اور سبک خرام ندی — افسانہ ایک شعر یا قطعہ کی مانند ہے۔ اور ناول ایک طویل نظم کی طرح — بہر حال مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی وحدت تاثر اور شدت تاثر — افسانے کے ذریعہ یہ مقصد فوراً حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ناول کے ذریعے نسبتاً دیر سے ادھر چونکہ انسانی طبائع و اذہان تاثر پذیری اور احساس اندوزی کے لحاظ سے ایک سی صلاحیتیں اور ایک سے ذوق نہیں رکھتے، لہٰذا مربیانِ فن نے ناول اور افسانہ کی دونوں "اصنافِ سخن" کو تربیت اذہان کیلئے پیدا کیا۔ اور ان دونوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا ہے — بات لمبی ہوتی جاتی ہے اور ادھر ایک خط کی محدود فضا اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ساتھ ہی فالج زدہ ہاتھ میں مدت کے بعد آج قلم پکڑا ہے۔ لہٰذا احتیاطاً اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہاں اتنا عرض کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ ابن فرید صاحب کے کچھ افسانے پہلے بھی میری نظروں سے گذر چکے ہیں۔ اور میں ان کی تحریروں میں ایک عمدہ افسانہ نویس کے جوہر منتشر دیکھ رہا ہوں۔ بہر کرم انہیں کسی نہ کسی طور پر اس کام کی سمت ضرور مائل رکھئے، وہ ایک ژرف نگاہ اور محنتی فنکار معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ اسی طرح محنت فرماتے رہے تو انشاء اللہ اس محنت اور اپنے خداداد اوصاف کے سہارے وہ ایک روز ضرور اس رخنے کو بھرنے کا موجب ہو جائیں گے۔ جو تحریک اسلامی کے ساتھ اچھے اور معیاری افسانہ نگاروں کی عدم وابستگی کے باعث اس کے ادبی مورچہ میں ان دنوں نمایاں نظر آتا ہے۔ خدا کرے یہ مرحلہ جلد طے ہو اور حق کے سپاہی اس کی بخشی ہوئی تاب و توانائی سے طاغوت کا بلیغ کر

کو ہر ہر مورچے پر شکست و نامرادی سے ہمکنار کر دیں!

یہ سطور بھی محض اس لئے لکھی ہیں کہ ابن فرید صاحب میں ایک فن کار شخصیت کا امید افزا پر تو جھلکتا نظر آتا ہے۔ جس کی مزید نشو و ارتقا انشاء اللہ خاصے خوش آئند نتائج کی حامل ہوگی۔ ورنہ سچ پوچھئے تو افسانہ نویسی کے میدان میں اپنے ہاں جوہر قابل ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔

ابن احمد:-

کتنے افسانے آئے دن لکھے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں اور سنے جاتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے قائم کی جاتی ہے اگرچہ یہ رائے منضبط نہ ہوتی ہو اور خواہ وہ وقتی ہی حیثیت کیوں نہ رکھتی ہو...... دسمبر ۵۲ء میں داغ داغ اجالے کے زیر عنوان محترم ابن فرید صاحب نے جو افسانہ معیار کی زبانی سنایا ہے چونکہ آپنے اسکو کسی وجہ سے اہمیت دیکر قارئین سے رائے طلب کی ہے۔ لہٰذا ایک مخلص قاری کی حیثیت سے جو کچھ رائے رکھتا ہوں قلم بند کرنے کی جرأت کر رہا ہوں شائد یہ بات پہلے ہی سے واضح ہو کہ جب رائے دینے کا سوال ہو تو دیانتداری کے سوائے ہر تعلق سے بے پروا ہو کر دیجاتی ہے۔

آپ کے الفاظ میں اسٹیونس کے بتلائے ہوئے تین مختلف طریقوں میں سے اس افسانہ میں تخلیقی عمل کا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا ہے یعنی افسانہ میں کردار کی اہمیت مقدم ہے پھر ماحول بھی کسی قدر خصوصیت کا حامل ہے۔ مگر پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔

افسانہ نگار کے دوسرے افسانوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر رائے زنی مناسب ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کی طبیعت کا رجحان جنسیات کی طرف ہے خصوصاً صنف نازک کے درمیان پھیلے ہوئے گوناگوں فکری و عملی فساد کی جانب اس کی توجہ پہلے پہنچتی ہے۔ بے شک افسانہ نگار آخر تک پہنچتے پہنچتے اپنے بعض افسانوں میں تنقید و اصلاح حال کی اس نازک ذمہ داری سے بڑی حد تک عہدہ برآ ہو جاتا ہے جو بحیثیت ادیب اسکے سر آ پڑتی ہے مگر کسی ایک گروہ انسانی کے مخصوص مسائل میں اسقدر دلچسپی لینا کہ دوسرے اہم مسائل کی اہمیت کبھی محسوس ہی نہ ہو

ایک انتہا پسند رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

آنند جی کا تبصرہ نہ صرف ناول اور افسانے کے فرق کو واضح کرنے کی حد تک درست ہے بلکہ بڑی حد تک خود افسانے کے بارے میں صحیح ہے۔ مگر جو کسی افسانے کے اندر تاثرات و کیفیات کی واقعہ بندی نہیں کر سکی۔ مگر اتنا واضح ہے کہ افسانہ کا کینوس تنگ بھی ہوتا ہے اور نازک بھی۔ ایک واقعہ کے مختلف تاثرات کا تو افسانہ متحمل ہو سکتا ہے لیکن واقعات کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اس میں نہیں ہوتی۔ داغ داغ اُجالے کے سلسلہ میں جی تو ایسا چاہتا ہے۔ کہ یہ افسانہ بس ایک ہی موڑ مڑتا ـــــ گھر یا کالج سے دفتر تک ـــ یا زیادہ سے زیادہ دفتر سے بال روم تک کی اجازت نکل سکتی ہے۔ اس صورت میں افسانہ کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے جہاں ایمبیسڈر سے واپسی کے بعد صبح کو اس کے کردھا طی اور اسکی مکروہ صورت دونوں کا منہ چڑانے کے لئے آئینہ موجود ہوتا ہے اس کے بعد جو کچھ افسانے کے تحت کہا گیا ہے دراصل وہ ایک دوسرے ہی افسانہ کا حصہ ہے جسے ایک ہی افسانہ میں پیش کر کے افسانہ نگار نے ایک طرح کی فنی زیادتی کی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آپ میرے تاثرات میں شریک ہوں مگر میں ابن فرید جیسے فنکار کے سلسلہ میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ انہوں نے کیونکر اسے جائز رکھا کہ ان کا یہ نازک فن پارہ ایک سپاٹ کہانی بن جائے۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ اُن کی یہ اچھوتی تخلیق ازدواجی زندگی کی گراں باریوں کو بھی سہار سکے گی۔

افسانہ کا جہاں سے غیر ضروری (با اعتبار فن اور حُسن) حصہ شروع ہوتا ہے وہیں سے دراصل افسانہ میں جھول بھی شروع ہوتا ہے چند روز بال روم اور دفتر کی متضاد زندگی گذارتے ہوئے نجمہ نے اپنی زندگی کے انجام کے بارے میں اتنی دور اندیشی سے کام لیا کہ وہ جان گئی کہ اس کی زندگی کی گاڑی بہت جلد کسی بہت بڑی خندق میں گر جائے گی۔ اور پھر کسی کے بس کا نہ رہیگا کہ اسے اس سے نجات دلا سکے۔ چنانچہ وہ ازدواجی زندگی پر راضی ہو گئی۔ یہ اپنے کردار کے بارے میں افسانہ نگار کی خوش فہمی ہی نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ چنانچہ نجمہ ازدواجی زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہی ناکام ہو جاتی ہے۔ [illegible] کاموں کو غلط سمجھنے لگتی ہے۔ پابند زندگی سے طبیعت بھر جاتی ہے ـــ

شادی سے پہلے اس کا مذبذب ہونا بھی محل نظر ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ اسکو اس امر کا تاثر حاصل ہو کہ ملازمت ہی اس کی اصل زندگی یا سامان زندگی ہے کیونکہ ازدواجی زندگی پر دفتری زندگی کو فوقیت دینا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے وہ بدستور فریب خوردگی کا شکار رہتی ہے۔ اور اس پر راضی بھی ہے۔ اس موقع پر شوہر کی عدم موجودگی کا عذر، عذر لنگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سراسر اپنے مردہ ضمیر کو فریب دینا ہے اور اگر افسانہ نگار اس عذر کے اندر کوئی معقولیت یا وزن محسوس کرتا ہے تو یہ اس کے کردار (نجمہ) کی خامی سے زیادہ اسکی فنی لغزش کا ثبوت ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ وہ ہر حال میں قبول حق کی صلاحیت سے یکساں طور پر عاری رہتی ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں اگر ہم اس کی بلند آوازیں سنتے ہیں تو غلطی سے اُسے طلب حق سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ چیخیں ہیں جو بے راہ روی کے دوران کھائی ہوئی شدید چوٹوں کے اثر سے بلند ہو جاتی ہیں۔

سب سے آخر میں ہم اس سبب کو واضح کرنا چاہتے ہیں جو اس فن پارہ کو ہر صورت سے مکمل اور معیاری بنانے میں حارج ہوا ہے مجھے یقین ہے کہ ہمارے بیشتر فنکاروں کو اپنی نازک ذمہ داری کا ضرور احساس ہوگا۔ یہ ذمہ داری دوگونہ ہے ایک نظریاتی حیثیت سے عائد ہوتی ہے۔ دوسری فنی حیثیت سے۔ اس سوال سے قطع نظر کہ کون سی ذمہ داری مقدم ہے۔ دونوں ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا ایک کامیاب فنکار کے لئے ہم شرط لازم سمجھتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہر فنکار اپنی اُفتاد طبع کے لحاظ سے ان دوگونہ ذمہ داریوں کا کم و بیش احساس رکھتے ہوئے میدان ادب میں اتر سکتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک سے یکسر صرف نظر کر کے کامیاب ادیب نہیں کہلا سکتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادیب اپنی نظریاتی حیثیت کے تقاضے کے احساس میں غلو کر کے فنی حیثیت کے تقاضوں کو بھلا بیٹھتا ہے۔ یہ صورت حال اگر شروع ہی سے اختیار کی جائے تو پوری تخلیق فنی اعتبار سے ناکارہ بنکر رہ جاتی ہے۔ ورنہ جہاں سے اختیار کی جاتی ہے وہیں سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ غلطی سے ایک ادیب کی ذمہ داری ہی اسکو بھی [illegible] سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمارے فکر و عمل کی غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ اصلاح کی طرف نہ صرف [illegible]

اس خرابی کا مکمل نسخہ بھی تجویز کرے۔ واقعیت Realism اور مثالیت (ism) کے درمیان ایک ادیب کے متوازن طرزِ عمل کو متعین کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے ایک مفکر ادیب کی یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے اسے اس طرح پیش کیا جائے کہ جو کچھ ہونا چاہیئے خود بخود سامنے آجائے" یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اپنی تخلیق میں اس اصول کو کما حقہ نبھانا ایک ادیب کے لئے آسان بھی نہیں۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس پر ہمارے ادیبوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔

"داغ داغ اُجالے" میں افسوس کہ اس اصول کو کامیابی کے ساتھ نہیں نبھایا گیا۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسکو تو پیش کیا ہی گیا ہے۔ مگر جو کچھ ہونا چاہیئے۔ وہ بھی پیش کر دیا گیا ہے یہ اس افسانہ کی ناکامی کا راز ہے

بیشک ابن فرید صاحب نے چند افسانے بہت کامیاب پیش کئے ہیں۔ اور ان سے افسانوں کے مجموعہ کا مطالبہ کئے جانے میں میں بھی ایڈیٹر معیار کا ہمنوا ہوں۔ مگر یہ خیال داغ داغ اُجالے کے بعد کا نہیں پہلے کا ہے۔ اس افسانہ کا اُٹھان بیشک اپنے اندر عظیم افسانہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ عظیم افسانہ بن نہ سکا بلکہ "یہ جہاں" ——— کو سامنے رکھتے ہوئے اسکو ترقی معکوس (Counter Progress) بھی کہہ سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بار اور میں اپنے سرمایۂ خلوص کو حاضرِ خدمت کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ افسانہ چاہے مختلف۔۔۔ حیثیتوں سے ناپسند ہو۔ مگر ابن فرید صاحب ضرور عزیز ہیں اور ان کی افسانہ کی راہ میں کامیاب کوششوں کا دل سے معترف ہوں:۔

تنقید نمبر پر تنقیدی نظر

جیب الرحمٰن خاں (میوات)

مسلسل انتظار و بہیم شوق و اضطراب کے بعد معیار کا تنقید نمبر نظر افروز ہوا۔ پڑھکر عجیب سرور حاصل ہوا۔ بعض مضمون البتہ میری تشنہ لبی دور نہ کر سکے۔ مثلاً عربی شاعری پر جس نوعیت کا مضمون درکار تھا۔ وہ معدوم ہے۔ اس قسم کا مضمون اس سے پیشتر فروری ۱۹۵۲ء میں آچکا ہے اب تو عربی شاعری میں اسلامی اقدار کو اجاگر کرنے کا موقع تھا۔ حماسہ علیب کی جاہلی شاعری کا ایک بہترین مرقع ہے۔ فاضل مضمون نگار کو چاہئے تھا کہ وہ کوئی انتخاب عہدِ اسلامی شاعری کا کرتے اور پھر موازنہ کر کے بتلاتے کہ اسلام نے عربی شاعری میں کس طرح عظیم انقلاب برپا کیا۔

محمود الحسن شاہد:۔

برادرم محترم ہدیۂ سلام و خلوص

سب سے پہلے اس قابلِ قدر شاہکار پر بے اختیار مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے یہ اس لئے بھی کہ اس دورِ نفاقی و عریانی میں طبیعتوں کے عام رجحان کے خلاف اور حالات کی ناسازگاری قدم قدم پہ مشکلات کی کثرت کے باوجود ہمت کر کے جو کچھ ہو سکا آپ نے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اور توقع کے خلاف ہر حیثیت سے مفید اور قابلِ اطمینان آپ کی اس ساعی جمیلہ نے عام اسکے کہ وہ ترقی پسندوں کا حلقہ ہو۔ یا کوئی اور کم از کم اس حقیقت کو ثابت کر دیا۔ کہ ادب اسلامی اپنا ایک مخصوص گرانقیمتی اور وسیع تنقیدی ذخیرہ رکھتا ہے اور دوسرے تمام مکاتیبِ فکر کے خلاف اس کا اپنا ایک الگ اور مستقل فلسفہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اسکول سے تعلق رکھنے والے نقاد اور ادبا اس سے دلچسپی رکھتے ہوئے اسکے متعلق اظہارِ خیال نہ کریں۔ جبکہ اب تک وہ اپنی تنگ نظری کی بنا پر صرف نظر کرتے آئے ہیں۔ انشاء اللہ یہ تنقید نمبر تعمیر پسند ادب اور اسکے تنقیدی اندازِ فکر کو دوسرے سنجیدہ و باشعور حلقوں کے سمجھنے میں کافی معاون ہوگا اور یہ بات کھلکر سامنے آجائے گی۔ کہ ہماری ادبی تنظیم کی بنیاد کس قدر گہری ہے۔ اور کتنے تناسب اور ارتقائی مراحل کی پیداوار ہے نیز ہمارے ادبا و مفکرین نے کس تھوڑی سی مدت میں اس میدان کو کتنا وسیع و کارآمد بنایا ہے۔ آگے چند سطروں میں اپنی رائے درج کرتا ہوں۔ اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ بالکل ضروری نہیں کہ سب کی رائے ہمیشہ ایک ہو۔ اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے

ادب اور اسلامی ادب ——— مسعود جاوید

مقالہ پر مغز اور سنجیدگی کا حامل ہے صاحب مقالہ نے ادب کا صحیح مقام اور اسکی غرض و غایت بیان کرنے میں مقصدی بحث کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب زندگی کی تنقید کا نام ہے۔ اور زندگی چونکہ متضاد و وسیع اچھے برے

قسم کے خیالات کی آماجگاہ ہے اس لئے ہر دور کا ادب زندگی اور
فطرت کی پیچیدگی کے باعث اپنے مختلف طرز فکر بتیائن تصورات کا
اظہار کرتا ہے تاہم بعض اقدار ایسی بھی ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور
پر ہر دور کے ادب میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اسی لئے ہمیں بعض
بے ادبا میں بھی چند باتیں مل جایا کرتی ہیں۔ جو اسلام کی نگاہ میں
مفید اور دلچسپ ہیں حالانکہ وہ فکر و نظر کے اعتبار سے سراسر قابل
تنقید ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسعود صاحب نے شعراء جاہلی
پیش کیا۔ جو باوجود غیر موحد ہونے کے انسانی خصائل کے احترام کے
قائل تھے۔ پھر اس کے بعد گریز کرکے اُردو کے پرانے شعراء کو لائے ہیں
اور یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں تعمیری رجحانات اور ادب و زندگی کے
درمیان گہرے ربط کا پتہ چلتا ہے اور مومن و غالب کے یہاں تو یہ شعور
زیادہ نکھرا اور کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ جو آگے چلکر حالی و شبلی کے پیکر
مادیت میں جلوہ فرما ہوکر اصلاح و انقلاب کے دھارے میں بدل
جاتا ہے۔ یہاں ادب باقاعدہ زندگی کا ترجمان اور کائنات کا
شارح بنکر سامنے آتا ہے۔ بالآخر اسی کے گود سے اقبال جنم لیتا
ہے۔ جسکا تمام زور انسانیت کے لئے ایک صحیح ادرار تقاء حیات
کے لئے ایک پائیدار فلسفہ تھا اقبال تعمیر پسند ادبا کے لئے خضر راہ کی
حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سے ادبی دنیا میں دو مستقل اور الگ
الگ نظریئے پرورش پاتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ جس نے ادب کو تمام تر
حسی تصور حیات کا تابع بنا دیا۔ اور اسی مقام سے تعمیر پسند ادب باقاعدہ
تنظیمی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ یہ تاریخی ترتیب مسعود صاحب
کے ذوق اور تنقیدی ذمہ داری کو بھاتی ہے البتہ ایک چیز جو سمجھ
میں نہیں آتی وہ یہ کہ جناب نے ادب کو پروپیگنڈہ سے الگ تسلیم
کرکے اسکی سرحدیں تعین میں عربی کے جن شعراء کو پیش کیا ہے
ان سے مجھے اختلاف ہے اسلام نے آکر یقیناً عربوں کو ایک نیا طرز فکر
اور ایک نئی تحریک زندگی سے روشناس کرایا اس انقلاب نے جہاں
دور اثرات حیات انفرادی و اجتماعی میں چھوڑے قلب و نظر کے بدلنے
سے شاعری کو بھی اپنے لئے نئے اسلوب اختیار کرنے پڑے اور سیاست
معیشت معاشرت و ادب سارے کے سارے اسلام کے گرد چکر
کاٹنے لگے۔ اب ادب میں اسلامی و تعمیری رجحان سمویا جانے لگا۔ لیکن
ہما تسکار جو دور جاہلیت میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ آگ و شعلہ برساتے

تھے۔ سینوں کو گرمانا اور دلوں کو برمانا جنکی شاعری کا کمال فن تھا
یکایک سرد و ٹھنڈے پڑ گئے نئے فکر اور نئے شعور کو شاعری کے
پیکر دلربا میں اُتارنے سے ناکام رہے اور ادب اور پروپیگنڈا دونوں
ایک ہی اسٹیج پر آگئے غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی کہ عربی قوم چونکہ فصاحت
و بلاغت پر مرتی اور سر دھنتی تھی۔ اسکے شعرا اور ادیب اپنے کمال پر
مفتخر تھے۔ قرآن نے آکر فصاحت و بلاغت کی ایسی شمع جلائی جسکے
آگے ان کے سینے دھندے پڑ گئے۔ اس لئے فنی انحطاط شاید اسی
مرعوب کن ذہنیت کا نتیجہ ہو دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ
انقلاب ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ ذہن و فکر بدلے ابھی
کتنے دن ہوئے تھے اس لئے نئے تصور کے ساتھ ساتھ نئے فارم
اور اسٹائل کی ضرورت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ دلکش فارم کے لئے دو تین
کیا برسوں کی مدت چاہیئے۔ تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ شعراء جاہلی کے
شعور کو بیدار کرنے میں جن محرکات کا دخل تھا۔ انہیں اسلام نے
ناجائز ٹھیرایا بلکہ مطلق حرام قرار دے دیا۔ اس فوری تبدیلی کی بنا پر
ان کے شعور کو تیز شعلہ بتاں کرنے والا اور کوئی محرک نہ مل سکا
وجہ کچھ بھی ہو یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔

عہد جاہلیت کی عربی شاعری کا پس منظر۔ افتخار اعظمی۔

مضمون طویل ہوگیا ہے موصوف نے طوالت کے ساتھ ساتھ
اگر موضوع کی ہمہ گیری کے پیش نظر زبان کی شگفتگی کا اہتمام کیا ہوتا۔
تو پڑھنے والے کو کھکاوٹ سے نہ دوچار ہونا پڑتا۔ البتہ اس کا اندازہ
ضرور ہوتا ہے کہ دور جاہلی کے سماجی عوامل معاشی محرکات سیاسی
ضرورتوں کا تجزیہ کرنے میں انہوں نے کافی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے
اور بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کے پیچھے جو قوتیں اور طاقتیں کام کر رہی
تھیں ان کو کسی حد تک سمجھانے میں بھی کامیاب ہیں۔ لیکن یہ کام
یہیں تک نہ تھا جہاں مقصدی مباحث اور ان کی عقلی تشکیل کے
اسباب پر غور و فکر کیا گیا تھا۔ شاعری کے حسین مناظر بھی پیش کئے
جاتے اور فن کے معیار پر تولا اور پرکھا جاتا۔ اگرچہ جیسا کہ موضوع ہے
اس کیلئے یہ مسئلہ خارج از بحث تھا تاہم اجمالاً ان کی شاعری
پر تبصرہ خصوصاً صنف سخن کے ہر ہر شعبہ پر ان کی تحقیقات کا جائزہ
مضمون کی وقعت کو دوچند کر دیتا۔ دوسری چیز جو مجھے اس مضمون
میں محسوس ہوئی۔ وہ یہ کہ افتخار صاحب اپنے مفہوم کو ادا کرنے میں

ذوق کے خلاف پر پیچ راستوں کو پسند کیا ہے حالانکہ تعمیر پسند ادب کی ایک یہ بھی خوبی ہے۔ کہ بات میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ... پختگی اور زود فہمی کی صلاحیت ہو۔ ادھر نوک قلم سے نکلا نہیں کہ قاری کے دل و دماغ کو بجلی کی طرح چیر گیا۔

شاعر کا قول و فعل۔ امتیاز علی عرشی۔

مصنف نے اپنے دعاوی میں زیادتی سے کام لیا ہے جس کی پوری پوری ہمنوائی میرے بس کی نہیں۔ عقل و کردار انسان کی دو جداگانہ صلاحیتیں ہیں۔ ضروری نہیں وہ دونوں کو بیک وقت لیکر آگے بڑھ سکے۔ جیسا کہ موصوف نے اسکو ثابت کرنے میں پورا پورا زور صرف کیا ہے البتہ کثرت و قلت کا تناسب رہا ہے۔

کردار ہے کیا؟ جہاں تک میں نے سمجھا ہے عقل کے شعوری حرکت و رجحان کا نام ہے۔ اور اسکے طریق اظہار اور تعمیل حکم کا جواب یہاں عقلی کیفیت اور اسکے حسن و قبح کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان کے عقل و مزاج اور اسکی تربیت میں صالح و پاکیزہ عناصر نے حصہ لیا ہے تو پھر اسکی کرداری حیثیت بھی اغلباً سنجیدہ صاف اور ستھری ہوگی۔ اسکے قول و عمل میں تضاد کے بجائے یکانگت و یکسانیت پائی جائے گی۔ وہ خلوت و جلوت دونوں میں یک رنگ یک آواز ہوگا اور یہی ادب اسلامی کا طرۂ امتیاز اور ہمارا مطلوب ہے۔ عقیدہ کی پختگی اور اس پر کامل یقین زندگی کے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے بڑے مہمات تک کو گرفت میں رکھتا ہے۔ مقصد کی لگن اور اسکا خیال و دھن اسے زندگی کے بڑے بڑے ہمالہ کو پرکاہ سمجھتا ہے خود موصوف کی نظروں میں حضرت حسانؓ کے علاوہ حضرت عمر بن کلثوم عنترہ شنفری۔ سب ہی ہوں گے۔ ان کی بہادری عالی حوصلگی جوانمردی بے جگری کا غلغلہ سفینوں ہی میں نہیں بلکہ ان کے سینوں سے بھی ابلا کرتی تھی۔ وہ رزم و بزم دونوں کے شہسوار تھے۔ جو کچھ کہتے ایسے کرتے بھی دور کیوں جائیے شارح حیات ترجمان حقیقت علامہ اقبال سے ملنے والوں کا بیان ہے کہ آخری زندگی کے چند فیض سالوں میں وہ اپنے مرد مومن کے صحیح جانشین اور مرد قلندر کے آئینہ دار تھے۔ لیکن یہ یک رنگی یکسانی اسی وقت ممکن ہے جبکہ شاعر کچھ ایسے تصورات سے وابستہ ہو جہاں آخرت کا مفاد زندگی کا نصب العین اور افعال و کردار میں اسکی حیثیت فیصلہ کن عنصر کی ہو اس موقع پہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ طرفہ وغیرہ تو اس احساس و شعور سے بے گانہ تھے۔ پھر کیونکر ممکن ہوا تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ عربی قوم اگرچہ رشد و ہدایت کے باب میں برسوں سے محروم رہی تھی لیکن ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کی کمی نہیں تھی۔ انہیں چیز تھی جو ان کی شاعری کو اس حد تک لاتی تھی۔

بقیہ ص ۳۶ مغربی ادب کے تین دور

رومانی کہانیوں حسن و عشق کی بے سروپا داستانوں لطائف، و جھوٹے واقعات کے ضمن میں خواہ مخواہ الجھ کر رہ گا وہ بغیر کسی عقلی دلیل کے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی، صنف مخالف کے ساتھ آزادانہ اختلاط اور عریاں و بیہودہ میلانات کے اظہار کو جائز اور صحیح قرار دے گا پھر چاہے نظاہر وہ اعلیٰ مقاصد اور مستقبل کی تعمیر کے منصوبوں کا کتنا ہی ڈھونگ رچائے۔

(باقی آئندہ)

خیال اپنا اپنا

دو ماہی "نئی نسلیں" لکھنؤ

مرتبین :- م۔ نسیم، طیب عثمانی
پتہ :- ۴۔۱۰ نظیر آباد لکھنؤ۔

اس نئے دو ماہی کے کئی شمارے نظر سے گذر چکے ہیں۔ نسیم صاحب نے اس نئے رسالہ کو جس اٹھان کے ساتھ تعارف کرایا ہے وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ خوبصورتی۔ گٹ اپ اور طباعت کے لحاظ سے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ خالص ادبی نہیں بلکہ علوم و فنون کے تقریباً تمام ہی گوشے اس کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اگرچہ فی الحال رسالہ کا حجم اس پھیلاؤ کا متحمل معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن نسیم صاحب کی اسکیم اچھی ہے اور وہ یہ کہ ہر شعبہ علم کا ایک نگراں بنا دیا گیا ہے۔ جو اپنے شعبہ کے معیار مضامین کا ذمہ دار ہے۔ ادب کی اصناف کے نگراں الگ الگ مقرر کئے گئے ہیں۔ اگر اچھے نگراں مل جائیں اور ساتھ ہی وہ کام کرنے والے بھی ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسکیم کامیاب نہ ہو اس طرح علمی کام اچھے پیمانے پر کیا جا سکتا ہے۔

نسیم صاحب، صاحب صلاحیت بھی ہیں اور صاحب وسائل بھی اس لئے ہمیں امید ہے کہ وہ "نئی نسلیں" کو روز افزوں ترقی دے کر اسلامی ادب کا معیار قائم کریں گے۔ داخلی حیثیت سے بھی اور خارجی رنگ روپ کے لحاظ سے بھی۔

ایک چیز البتہ ہمیں شدت سے کھٹکی ہے جو خلوص و دیانت کے ساتھ بغیر کسی آزردگی کا لحاظ کئے واضح کر دینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ "نئی نسلیں" کا رجحان شروع سے نعروں کی ایجاد کی طرف پایا جاتا ہے۔ مثلاً ادب برائے زندگی۔ زندگی برائے بندگی۔ (یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بندگی کیسی؟ بندگیٔ رب یا مجرد بندگی جس کا مطلب غلامی کی تعلیم بھی نکل سکتا ہے)۔ یا مثلاً شمارہ اول کے اداریہ میں اس طرح کی قافیہ پیمائی کی گئی تھی۔

زندگی بے زندگی افسردگی آزردگی، شرمندگی، زندگی پابندگی پائندگی، "تابندگی"، .... وغیرہ وغیرہ۔

اول تو نعرہ ایجاد کرنے کی ہمارے یہاں اس وقت کوئی ضرورت ہی نہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو یہ کام ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں ایک دو الفاظ میں پورے مزاج کو سمو دینا پڑتا ہے۔ یہ کام ایک فرد کے کرنے کا نہیں۔ اس لئے اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ بات چونکہ اب "نئی نسلیں" ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اسکی پیروی میں ایک اور جریدہ نے بھی اسکو اخذ کر کے نمایاں طور سے شائع کیا ہے۔ اس لئے یہ وضاحت غالباً مناسب سمجھی جائے گی۔

۱۹۵۵ء کو "نئی نسلیں" نے نئے نمونہ کا سال قرار دے کر ایک دو ماہی اشاعت اور اس کے ساتھ ایک مختصر اضافی اشاعت عمل میں آ رہی ہے تازہ اضافی اشاعت میں ایک مفید تنقیدی مطالعہ ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ہے جس میں کلام اقبال کے تخلیقی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے پچھلی اضافی اشاعت میں اختیار اعظمی کے قلم سے عشقیہ شاعری کے موضوع پر درج کیا گیا ہے۔ جسکو مرتبین نے بحث و نظر کی آماجگاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ مقالہ اگرچہ تجزیہ اور انتخاب کلام کے لحاظ سے کمزور ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا موضوع بہت اہم ہے یہ موضوع تخلیقی تجربوں کے ساتھ تخلیقی تنقید بھی چاہتا ہے۔ تعمیری ادب میں عشقیہ عناصر کا مقام ابھی پوری طرح صاف نہیں ہے یہ سب مانتے ہیں کہ عشق کا غیر صحت مند تصور تعمیری ادب میں کوئی مقام نہیں پا سکتا۔ لیکن صحت مند تصور کیا ہے اور اسے کیا مقام ملنا چاہیئے؟ اس کا جواب ابھی دیا جانا ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ تر تخلیقی ہے تنقیدی

بھی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں شاید کم سے کم ہمارے یہاں فنکاروں نے انفرادی حیثیت سے عقیقہ شاعری کے موضوع پر جو تجربے کئے ہیں وہ چاہے آگے چل کر ہمارے لئے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن تاریخی اہمیت کے لحاظ سے ان سے صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت ہمارے پاس تجربہ کی سہولت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم ایک قابل اعتماد فنکار کے کام آسکتے ہیں۔ اگر یہ چیز زبان بندی کی نذر ہو جائے تو پھر ترقی معلوم۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا وہ پہلو جو تخلیقی تجربات سے متعلق ہے اب کچھ تخلیقی تنقید پر بھی غور فرما لیجئے۔ تخلیقی تنقید میں دو مفہوم داخل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود تخلیقی ادب کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ یعنی اس میں تخلیقیت پائی جاتی ہو دوسرے وہ تخلیقی ادب کے لئے ایک بہتر فضا پیدا کرتی ہو۔ اور فنکار کی تخلیقی صلاحیتوں اور نئے تخلیقی تجربوں کے نشوونما اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہو ـــــ اس موضوع پر انتخاب اعظمی کا طویل مقالہ ہو یا ابن فرید کی تشریحی اور وحیدالدین خاں کی تجزیاتی تنقیدیں۔ ان میں یہ دونوں بنیادی چیزیں موجود ہونی چاہئیں۔ اس سے ایک طرف تو فنکاروں کو اس بات کی آزادی بھی مل سکتی ہے۔ کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دیکر اپنے تجربات سے تعمیری ادب کے نئے نئے گوشوں کو منور کر سکیں۔ اور دوسری طرف انہیں بے راہ روی سے روکا بھی جا سکتا ہے جو تعمیری ادب کی اس ابتدائی تاریخ میں بہت ضروری ہے۔

بہرکیف "نئی نسلیں" سے ہمیں بہت امیدیں ہیں۔ اس نئے اقدام کے لئے مرتبین اور خصوصاً نسیم صاحب مستحق مبارکباد ہیں۔

ہفتہ وار "عزم" بنارس

ادارہ:۔ رفیق احمد بہاری۔ خمار اکبر آبادی۔ حمید اللہ بنارسی

سالانہ قیمت تین روپے فی پرچہ ۲ر۔

پتہ:۔ ہفتہ وار "عزم" ندیسر بنارس۔

اس ہفتہ وار کے بہت سے شمارے دیکھنے کے بعد تبصرہ نگار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ہفتہ وار کئی چیزیں ایک ساتھ لیکر چلنا چاہتا ہے اس میں کچھ نظموں، غزلوں اور کہانیوں کی چاشنی بھی ہے، سویٹ یونین میں مذہبی عقاید کی آزادی، جیسے موضوع پر آپ کو مضمون بھی مل سکتا ہے اور پٹنہ کے لحاظ سے نئی جماعتوں کے جلسوں اور میمورنڈموں کا بیان بھی اس لحاظ سے اس میں ہلکا پھلکا پن بھی ہے مقامیت بھی اور جماعتیت بھی۔ جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے اگر ہمارے ناظرین میں سے اردو کے کچھ ایسے عاشق ہیں جو ہر قسم کی تحریر کو سینے سے لگالینے ہی کو اس مسئلہ کا واحد حل سمجھتے ہیں۔ تو انہیں "عزم" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اہم ہدایتیں

مصنف:۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ قیمت ۷ر صفحات ۵۶

ناشر:۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور

موضوعات کا اندازہ ذیل کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تعلق باللہ ۲) بے جا پندار سے احتراز ۳) قریبی ماحول کی اصلاح (۴) سمع وطاعت اور امر و نظم ۵) مجاہدہ فی سبیل اللہ ۶) مخالفین ۷) خواتین کے لئے ہدایات۔

ظاہر ہے کہ اس میں عام دلچسپی کی باتیں کم ہیں فلسفہ کے بجائے عملی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ مخصوص لوگوں کے لئے ہے۔ مگر ہے خاصہ کی چیز۔

"سود" حصہ دوم

مصنف:۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناشر:۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور

پیش نظر کتاب مولانا مودودی کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ جنہیں اس قسم کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے اور ان کو جدید طریق پر پیش کرنے میں خاص ملکہ ہے۔

اس کتاب میں سود کی توجیہات، عقلی حیثیت سے اسکے جواز اور عدم جواز پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور دلائل کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سود ایک ایسی لعنت ہے جو معیشت انسانی کے لئے ایک مہلک ناسور ہے اس میں سود اور اسکے آغاز اور اسکی ترقی کو پوری تفصیلات کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ جدید بنکنگ کے طریقے بغیر سودی سسٹم کی تنظیم کے سلسلہ میں بہت سے ایسے بنیادی اصول اجمالی طور سے بتائے گئے ہیں۔ جو یقیناً